شیخ سلیم احمد

یہ کتاب عبدالرحیم خانخاناں کے حالات زندگی
کے علاوہ ان کے عہد کا تہذیبی اور مذہبی منظر نامہ
بھی ہے۔ یہ اس مشترکہ تہذیبی ورثہ کی کہانی ہے
جو دو قوموں کے باہمی لین دین سے وجود میں آیا
تھا۔ رحیم کی شخصیت اس ورثہ کی علامت کے
طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ وہ انڈو ایرانی تہذیب
کے پروردہ تھے مگر ہندی کے بلند پایہ شاعر بھی
تھے۔ رحیم کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں میں
پہلی بار نہ صرف یہ کہ تال میل پیدا کرنے کی کوشش
کی گئی ہے بلکہ دونوں پہلوؤں کا بھرپور جائزہ بھی
لیا گیا ہے۔ دیوناگری رسم الخط میں رحیم کے ہندی
دوہوں کا نمائندہ انتخاب ان کے اُردو معنوں کے
ساتھ کتاب کا حصّہ ہے جس سے اس کی ہندی شاعری
کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ کتاب نہ صرف دلچسپ
بلکہ بامقصد بھی ہے اور مفید معلومات سے بھرپور
ہے۔ مغل عہد کے واقعات نہایت دلنشیں انداز
میں بیان کیے گئے ہیں جن پر کہانیوں کا گمان ہوتا
ہے۔ کتاب نادر و نایاب تصاویر سے بھی مصوّر ہے۔

عبدالرحیم خانخاناں

شیخ سلیم احمد

ناشر : شیخ سلیم احمد

بار اوّل : ۱۹۹۰ء FIRST EDITION 1990

تعداد : ایک ہزار ایک سو۔

کتابت : محمد یوسف، شفیق الرحمٰن، محمد عمر انصاری

سرورق : انیس صدیقی

قیمت : 80 روپے

ABDUR RAHIM KHAN-E-KHANAN-A BIOGRAPHY

BY

SHEIKH SALEEM AHMED

ملنے کا پتہ

خسرو کتاب گھر۔ ۱۵۰ بستی حضرت نظام الدین۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۱۳

مطبوعہ جے۔ کے۔ آفسٹ پرنٹرز دہلی ۶

(ترقی اردو بیورو کے جزوی مالی تعاون سے)

تعارف

یہ کتاب عبدالرحیم خانخاناں کی مختصر سوانح ہے۔ مگر اس کے عہد کے فکری دھارے کو پیش کرنے کی کوشش بھی ہے۔ خانخاناں اس فکری دھارے کی علامت کے طور پر ابھرتا ہے۔ عہد اکبری اور جہانگیری مغلیہ سلطنت کا سنہری دَور ہے۔ جس میں نظریات و خیالات کی بڑی ہلچل ہے۔ مسلم حکومت کو ہندوستان میں چار سو سال سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے اور ہندو مسلمانوں کے اشتراک عمل سے ایک مخصوص تہذیب (جو نہ خالص مسلم ہے اور نہ ہندو اور جسے انڈو پرشین تہذیب کا نام دیا جاتا ہے) کے خد وخال نمایاں نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک ایسا سماج وجود میں آچکا تھا۔ رواداری، محبت، باہمی افہام و تفہیم کا جذبہ صلح کل۔ جیو اور جینے دو کا رویہ جس کی عام خصوصیات تھیں۔ ترقی پذیر بولیاں ہوں یا فن تعمیر۔ رہن سہن ہو یا لباس باہمی اشتراک عمل کی دلکش جھلکیاں ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ باہمی لین دین کے اس عمل کی رفتار اس عہد تک آتے آتے بہت تیز ہو گئی تھی۔ ہندوستانی مسلمان ہندوستانیت کے رنگ میں رنگ رہے تھے اور خود ان کے مخصوص کلچر اور مذہب کی چھاپ ہندوؤں پر گہری پڑ رہی تھی۔ الناس علیٰ دین ملوکہم کے اصول پر حکمراں طبقہ کے طور طریقے زیادہ اپنائے جا رہے تھے۔ اس سماج کی تعمیر میں صوفی سنتوں، شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کا بڑا ہاتھ تھا جس میں ہندو مسلمان برابر کے شریک تھے اور حکمراں طبقہ بادشاہ، شہزادے، بیگمات، امرا اور جاگیرداروں نے اس رجحان کو پروان چڑھانے میں مدد دی تھی۔ دراصل وحدت الوجود اور ویدانت

کے نظریات اس سماج کی متحرک قوت تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس عہد میں ہندو مسلمان میں کوئی تفریق نظر نہیں آتی۔ مسلمان سپاہی ہندو آقا کے لئے لڑتا نظر آتا ہے اور ہندو سپاہی مسلمان سپہ سالار کے لئے جان نثار کرتا ہے۔ اکبر نے اتنی جنگیں لڑیں مگر وہ زیادہ تر مسلمان حکومتوں کے خلاف تھیں اور اس نے ایک بھی ہندو ریاست کو اپنی سلطنت میں نہیں شامل کیا۔

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ المعروف مجددالف ثانی کے منظر عام پر آنے سے یہ بساط الٹ جاتی ہے اور دوسری بساط بچھتی ہے جس پر مذہب کا رنگ غالب تھا۔ مجدد الف ثانیؒ کی آمد کے ساتھ ہندوستان میں اسلام کے احیا کا آغاز ہوتا ہے۔ اور بنیاد پرستی اور کٹر مذہبیت کا دور شروع ہوتا ہے۔ مجدد الف ثانیؒ عبدالرحیم خانخاناں کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے اسے کئی خطوط لکھے ہم نے علاحدہ سے ایک باب میں ان کا ذکر کیا ہے۔ بعد میں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں

جو تحریکات ابھریں انھوں نے سولہویں اور سترہویں صدی کے متذکرہ بالا مشترکہ سماج کے رخ کو موڑ دیا اور فکر و خیال کا یہ دھارا مختلف سمت میں بہنے لگا۔ اس نئے انقلاب سے مسلمانوں کو کتنا نقصان پہنچا اور کتنا فائدہ ہوا، یہ موضوع علاحدہ سے ایک کتاب کا متقاضی ہے۔ البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ مذہبی اعتبار سے یہ تحریکیں کامیاب رہیں اور ان بزرگان دین کی مخلصانہ کوششوں سے اسلام ہندوستان میں ایک بلند منصب پر فائز ہو گیا مگر مسلمانوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور وہ سیاسی مقصد یعنی اقتدار کی بحالی بھی حاصل نہ ہو سکی جو ان تحریکوں کا بنیادی مطمح نظر تھا۔ مغلوں کے مضبوط مرکزی سیاسی نظام کے کمزور پڑتے ہی مسلمانوں کی کمزوریاں منظر عام پر آنے لگیں اور یہ مذہبی تحریکیں اس انحطاط کے روکنے میں بری طرح ناکام رہیں۔ بعد کے واقعات اشارہ کرتے ہیں کہ رحیم کے عہد میں جو سماج تعمیر ہو رہا تھا وہ زیادہ دوامی تھا اور اس کا تسلسل اگر درہم برہم نہ ہوتا تو شاید مسلمان اس ملک میں زیادہ عزت کی زندگی گزار سکتے۔

یہ کتاب عبدالرحیم خانخاناں اور اس کے عہد کا سرسری تعارف ہے۔ تحقیقی پیش کش ہرگز نہیں ہے۔ مجھے محقق یا مؤرخ ہونے کا بھی دعویٰ نہیں ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ عام قاری کے لئے ایک معلوماتی کتاب کہا جا سکتا ہے دراصل مجھے اعداد وشمار، اشخاص ومقامات کے ناموں اور تاریخوں سے طبعاً زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ نظریہ وخیال مجھے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتا ہے چونکہ یہ خیال ہی ہے جو زمان ومکان کے مجرّد خاکے میں رنگ بھرتا اور انہیں معنی عطا کرتا ہے۔ انسانی فکر ارتقا کی بنیاد ہے اور وہی تاریخ کے قافلہ کو آگے بڑھاتا ہے۔ اسی لئے میں نے کتاب کو حوالوں سے بھی بوجھل نہیں بنایا ہے۔ تاہم کتاب میں جن کتابوں سے مدد لی ہے ان کی تفصیل کتابیات میں درج کر دی ہے۔ واقعات پر خیالی آرائی میری اپنی ہے۔ جہاں دوسرے کی رائے پیش کی ہے وہاں حوالہ ضرور دے دیا ہے۔

عبدالرحیم خانخاناں سے متعلق ہندی، اُردو اور انگریزی میں جو بھی کتابیں یا مضامین میری نظر سے گذرے ہیں وہ مجھے یکطرفہ معلوم ہوئے۔ فارسی اور اُردو میں رحیم کے ایرانی اور مغل پس منظر پر زیادہ زور ہے اور اس کی ہندی شاعری کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے جبکہ ہندی اور کسی حد تک انگریزی میں صرف ہندی شاعری اور ہندو کلچر کو موضوعِ بحث بنایا گیا اور اس کے مغل یا مسلم پہلوؤں کو سرسری بیان کیا گیا ہے بلکہ ہندی اور انگریزی کے مصنفین نے مغل تاریخ کے بہت سے واقعات کو غلط پیش کیا ہے۔ میں نے اس کتاب میں اس کمی کی تلافی کی ہے۔ اور دونوں پہلوؤں میں تال میل پیدا کیا ہے اور رحیم کے ہندی اور ہندوستانیت کے پہلو کو بھی مغل پس منظر میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے اصل نمائندہ دوہوں کا انتخاب ان کے معنوں اور خصوصیات کلام کے ساتھ کتاب میں شامل ہے تاکہ قاری خود بھی اس کے کلام کی اہمیت کا اندازہ کر سکے۔

عبدالرحیم خانخاناں کی ہندی شاعری کا معاملہ خاصا متنازع ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ رحیم کا موجودہ کلام رحیم کا نہیں ہے بلکہ اس کے عہد یا بعد میں کوئی دوسرا رحیم یا رحیمن تھا جس کا کلام خانخاناں سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ ہندی میں شیو سنگھ سینگر نے شیو سنگھ سروج نام سے کتاب لکھی جس میں اس نے یہ بحث اٹھائی ہے اور بھکاری داس کوی

کی ایک کتاب کا ویر نرنیہ کے حوالہ سے دو رحیم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے اس بیان کو لے کر کچھ دوسرے ہندی ادیبوں نے بھی اسی طرح کے شک وشبہ کا اظہار کیا ہے۔ اردو میں بزم تیموریہ میں مولانا صباح الدین عبدالرحمن نے بھی رحیم کی ہندی شاعری پر سوالیہ نشان لگایا ہے، مگر میں اپنے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ موجودہ ہندی کلام جو ہم تک پہنچا ہے اس میں سے بیشتر کلام اسی عبدالرحیم خانخاناں کا ہے جو مغل دربار کا سپہ سالار اور اکبر کے نورتنوں میں ایک تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بھکتی سے متعلق دو ہے الحاقی ہیں اور وہ رحیم کے نہ ہو کر کسی دوسرے ہندی کوی کے ہو سکتے ہیں۔

اب تک کی تمام اسناد رحیم کے ہندی شاعری کرنے کی طرف اشارہ کرتی ہیں مآثر رحیمی جو تین جلدوں پر پھیلی ہوئی رحیم کی سوانح عمری ہے اور جسے اس کے ایک درباری عبدالباقی نہاوندی نے اس کے حکم سے تحریر کیا تھا۔ اس میں اس کی ہندی شاعری کا ذکر ہے اگرچہ شاعری کے نمونے نہیں دیے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس زمانہ میں ہندی شاعری قابل اعتنا نہیں تھی۔ مآثر الامرا (شاہنواز خاں) میں تو یہ بھی لکھا کہ وہ ہندی اور سندھی دو زبانوں میں بھی شاعری کرتا تھا اور رحیم تخلص کرتا ہے۔ ذخیرۃ الخوانین میں شیخ فرید کا ایک جملہ ملتا ہے جو یہ ہے۔

" بزبان فارسی و ہندی و سندھی شعر متین می گفت " اس سے بھی ظاہر ہے کہ رحیم کا موجودہ ہندی کلام اسی کا ہے۔ اس کے علاوہ رحیم کو زبانیں سیکھنے کا خاص ملکہ تھا اور جس کا ذکر ہر کتاب میں کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے بادشاہ کے حکم سے کچھ یوربی زبانیں بھی سیکھی تھیں۔ حجاز سے عربی اور نامانوس عربی بولیوں میں لکھے خطوط کے مطالب کے لئے اسی سے مدد لی جاتی تھی۔ متذکرہ بالا ہندی ادیبوں نے جس سند پر اپنے شک وشبہ کی بنیاد رکھی ہے وہ بھی ہم عصر نہیں ہے عبدالرحیم خانخاناں کی ہندی شاعری پر جس شخص نے اختصاص حاصل کیا ہے وہ مایا شنکر یاگک ہے جس نے اس صدی کے دوسرے دہے میں چھان بین کر کے رحیم کا منتشر کلام " رحیم رتناولی"

کے نام سے یکجا کیا اور یہی کتاب تمام ہندی لکھنے والوں کا ماخذ ہے۔ اس نے بھی اپنی تلاش و جستجو کے دوران رحیم کی ہندی شاعری پر کسی طرح کے شبہ کا اظہار نہیں کیا ہے۔ جب تک کوئی معاصر سند اس کے برعکس حاصل نہیں ہو جاتی، ہم رحیم سے منسوب موجودہ ہندی کلام اسی کی تصنیف ماننے پر مجبور رہیں۔

عبدالرحیم خانخاناں تیرہ برس کا تھا کہ اپنے مربی اکبر اعظم کے ہمراہ گجرات کی مہم پر روانہ ہوا۔ بعد میں گجرات کی جنگ کی کمان آزادانہ اس کے ہاتھ میں رہی۔ اس کے بعد سندھ میں جنگجوئی کا موقع ملا اور پھر دکن کے سلاطین سے معرکہ آرائی میں مصروف ہو گیا جہاں اس نے اپنی زندگی کے تینتس ۳۳ قیمتی سال گزارے۔ بہتر ۷۲ سال کی عمر میں بھی جب اسکی زندگی کی شام تھی وہ مہابت خاں کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف نظر آتا ہے اور اس طرح میدان جنگ میں ہی اس کا پیغام اجل آ پہنچا۔

ان جنگوں کی داستان بڑی پرپیچ ہے۔ کبھی کبھی جنگ کی بھول بھلیوں میں رحیم کا چہرہ گم ہوتا نظر آتا ہے۔ فتح و شکست کی ان کہانیوں میں رحیم کے اصل رول کو اجاگر کرنے کی سخت ضرورت تھی۔ رحیم سے متعلق اکثر اردو، ہندی اور انگریزی کی کتابوں میں اس کا یہ رول واضح نہیں ہوتا میں نے اس کمی کو بھی پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

مصنف کو عام طور پر کتاب کے موضوع سے پیار ہو جاتا ہے۔ کوئی نظریہ ہو یا شخصیت وہ مصنف کا ہیرو بن جاتا ہے اور وہ اس لئے غیر ضروری طور پر اس کا دفاع کرتا ہے۔ میں نے اپنے ہیرو کے سلسلہ میں یہ روش اختیار نہیں کی ہے۔ رحیم کے تئیں میرا رویہ ہمدردانہ ضرور رہے مدافعانہ نہیں۔ میں نے رحیم کی جبلّی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

اُن چند حضرات کا شکریہ ادا کرنا بھی واجب ہے، اس کتاب کی تیاری میں جنکا تعاون مجھے حاصل رہا۔ سب سے پہلے دیرینہ دوست محترم خلیل الرّب صاحب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کتاب کے اولین مسوّدہ کو بغور پڑھا اور بے رحمانہ مگر ہمدردانہ تنقید کی۔ ان کے مشوروں کی روشنی میں میں نے نہ صرف پورے مسودہ پر نظر ثانی کی بلکہ بعض ابواب

کو از سر نو لکھا۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے عالمانہ مشوروں سے بھی میں وقتاً فوقتاً فیض اٹھاتا رہا۔ میں ان کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں نیشنل آر کائیز آف انڈیا کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر ایس۔ اے۔ آئی۔ ترمذی صاحب میرے خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے مسودہ کے بعض حصّوں کو پڑھکر سنا اور مفید مشورے دیے۔ مجھے ان کا شاگرد ہونے کی بھی سعادت حاصل ہے۔ میرے تاریخی شعور کو جلا دینے میں ان کا بڑا حصّہ ہے۔ ڈاکٹر ماجدہ اسد صاحبہ نے رحیم کی ہندی شاعری کو سمجھنے میں میری مدد کی اور اس کے دوہوں میں پنہاں ہندو اساطیری کہانیوں کی وضاحت کی۔ معلوم ہوا کہ واقعی وہ ایک علم دوست خاتون ہیں۔ اس گرانقدر تعاون کے لئے وہ میرے شکریہ کی مستحق ہیں۔ حکیم عبدالحمید اپنے علمی اداروں کے ذریعہ جو کام کر رہے ہیں میں اس کتاب کو اس کام کی توسیع سمجھتا ہوں۔ اس کے علاوہ وہ میرے کاموں میں دلچسپی کا اظہار کرتے رہے ہیں اور انہوں نے اس کتاب کے لکھنے میں بھی میری توصلہ افزائی کی جس کے لئے میں تہہ دل سے ان کا شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم اور ابوالفیض سحر کا شکر واجب ہے جن کی توجہ اور دلچسپی سے ترقی اردو بیورو نے جزوی مالی امداد دینا منظور کیا۔

گھر کے افراد میں بیٹی بشرہ سلیم نے مسودہ کی پروف ریڈنگ، ٹائپنگ اور ہندی دوہوں کی ترتیب و تہذیب میں بامعنی مدد کی اور بیٹے ندیم شیخ نے طباعت و اشاعت کی منزلوں کو میرے لئے آسان کیا۔ یہ دونوں بھی میرے شکریہ کے حقدار ہیں۔

شیخ سلیم احمد

۲۷ / جولائی ۱۹۹۰ء

۱۵۰۔ بستی حضرت نظام الدین

نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۱۳

ترتیب

تصاویر

صفحہ

تصاویر

عبدالرحیم خانخاناں

اکبر اعظم

جہانگیر

اکبر اپنے مشیروں کے ساتھ۔ یہ تصویر اکبر کے آخری ایام کی معلوم ہوتی ہے۔ جس میں اکبر کے نورتن بیٹھے ہیں۔ بائیں جانب دوسرے نمبر پر مان سنگھ کو پہچانا جا سکتا ہے۔

مقبرہ عبدالرحیم خانخاناں ۱۶۲۷ء
نزد بستی حضرت نظام الدین۔ نئی دہلی

نیلا برج یا مقبرہ میاں فہیم

خانخاناں کی تعمیر کردہ سرائے ۔ لاہور
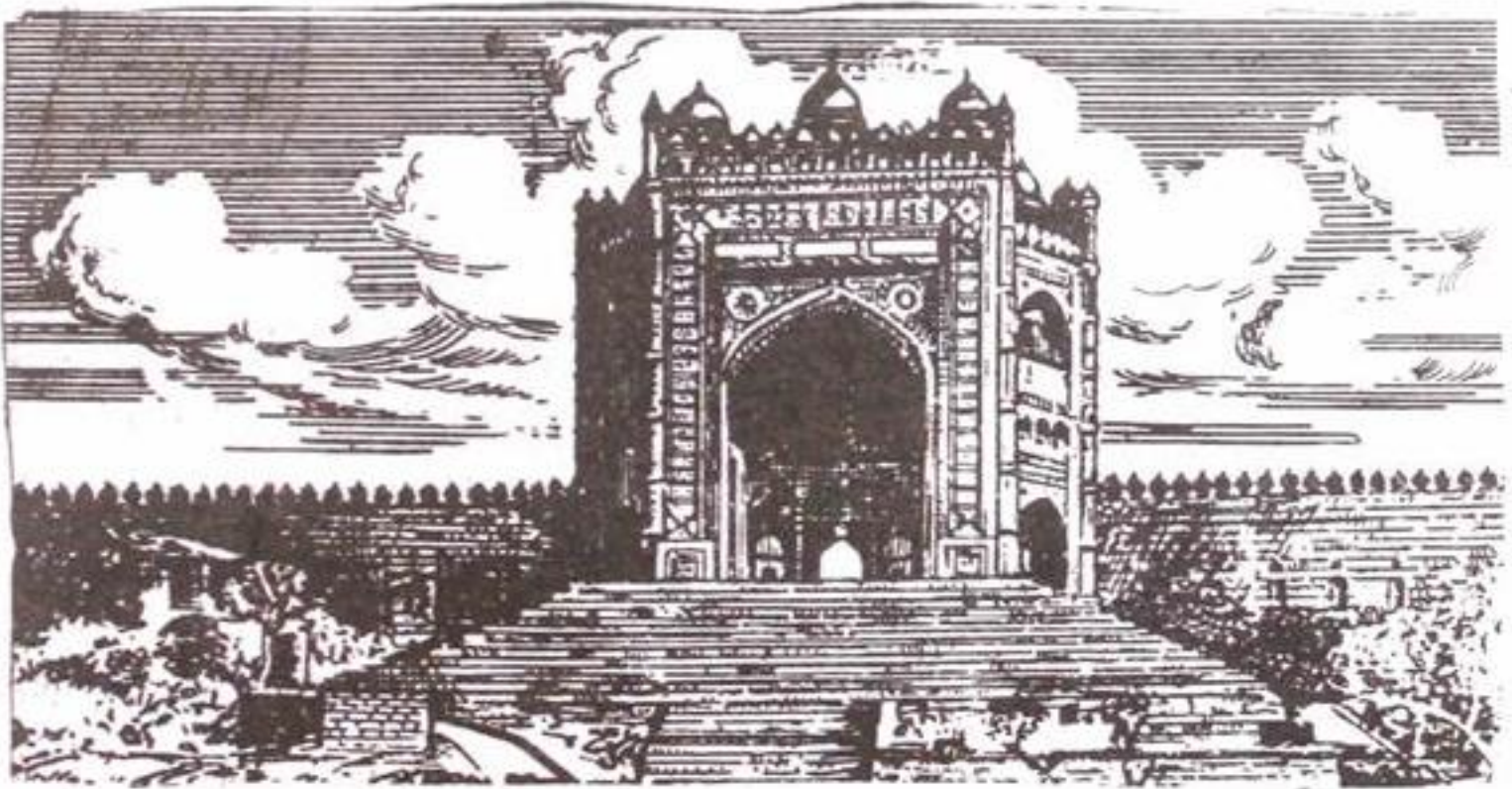
فتحپور سیکری میں اکبر کا تعمیر کردہ بلند دروازہ. جو اس نے فتح گجرات
کی خوشی میں تعمیر کرایا تھا۔ گجرات کو خانخاناں نے فتح کیا تھا۔
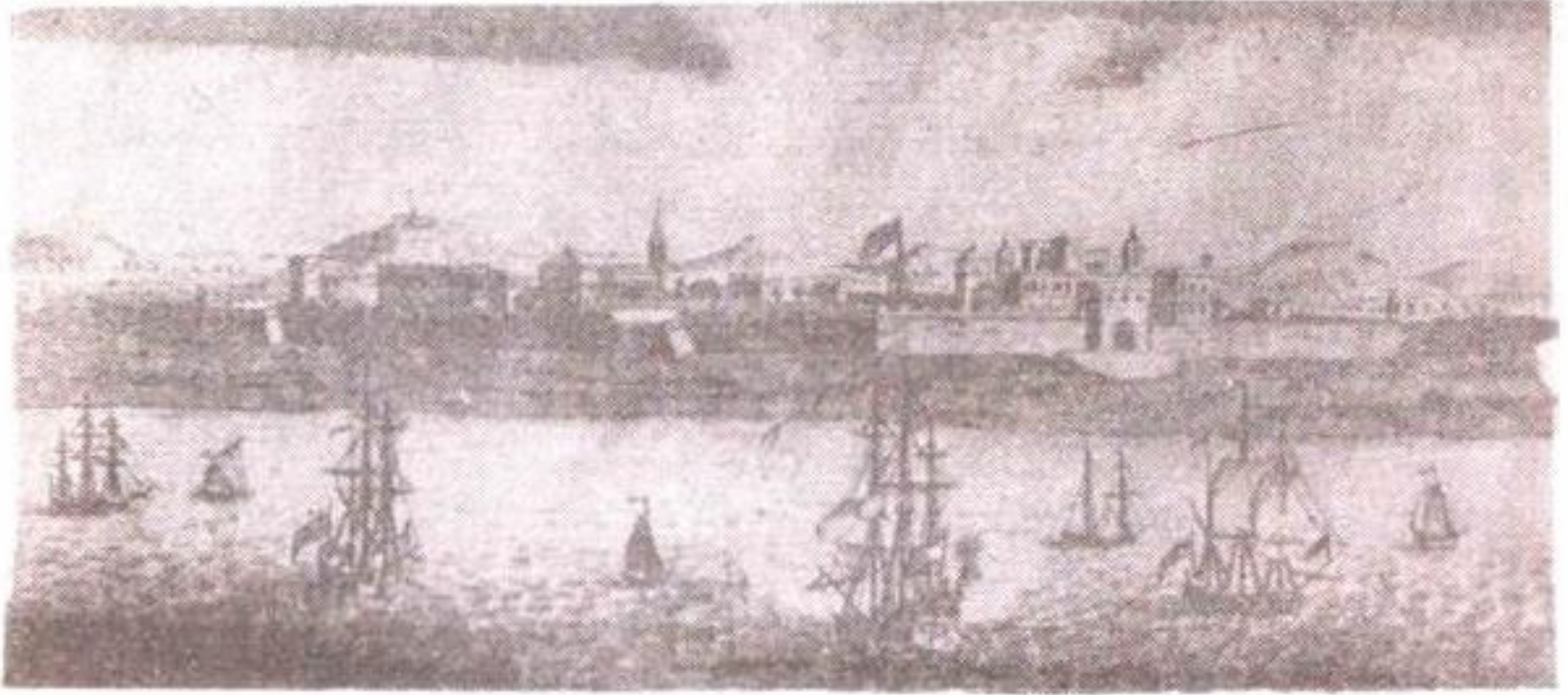
مدراس کے قریب ایسٹ انڈیا کمپنی کا تعمیر کردہ سینٹ جارج قلعہ اور فیکٹری جو ۱۶۳۹ء میں تعمیر ہوا۔ اسی کے طرز پر سورت اور گوا میں پرتگالیوں نے اپنے قلعہ تعمیر کیے۔ اس ڈرائنگ سے اس عہد کے یورپی طرز تعمیر و رہائش کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے جو ایجنٹ یا تاجر کام کرتے تھے وہ فیکٹرس کہلاتے تھے بعد میں اس جگہ کو فیکٹری کا نام دیا گیا جہاں یہ فیکٹرس کام کرتے تھے۔ اسی لئے یورپی قوموں کے یہ قلعے فیکٹریاں کہلاتے تھے۔
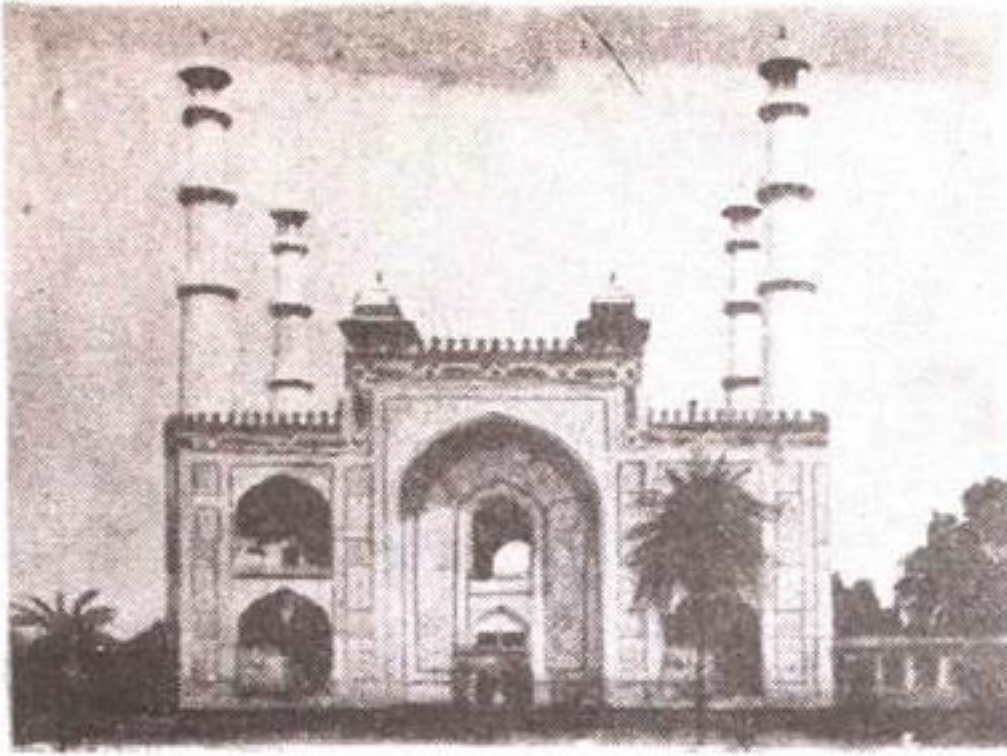
اکبر کے مقبرہ کا صدر دروازہ۔ سکندرہ

شہرہ آفاق ہلتے ہوئے منارے۔ احمد آباد

احمدآباد کے قریب روضہ سرکھیج

مسجد رانی روپ متی ۔ احمدآباد ۔
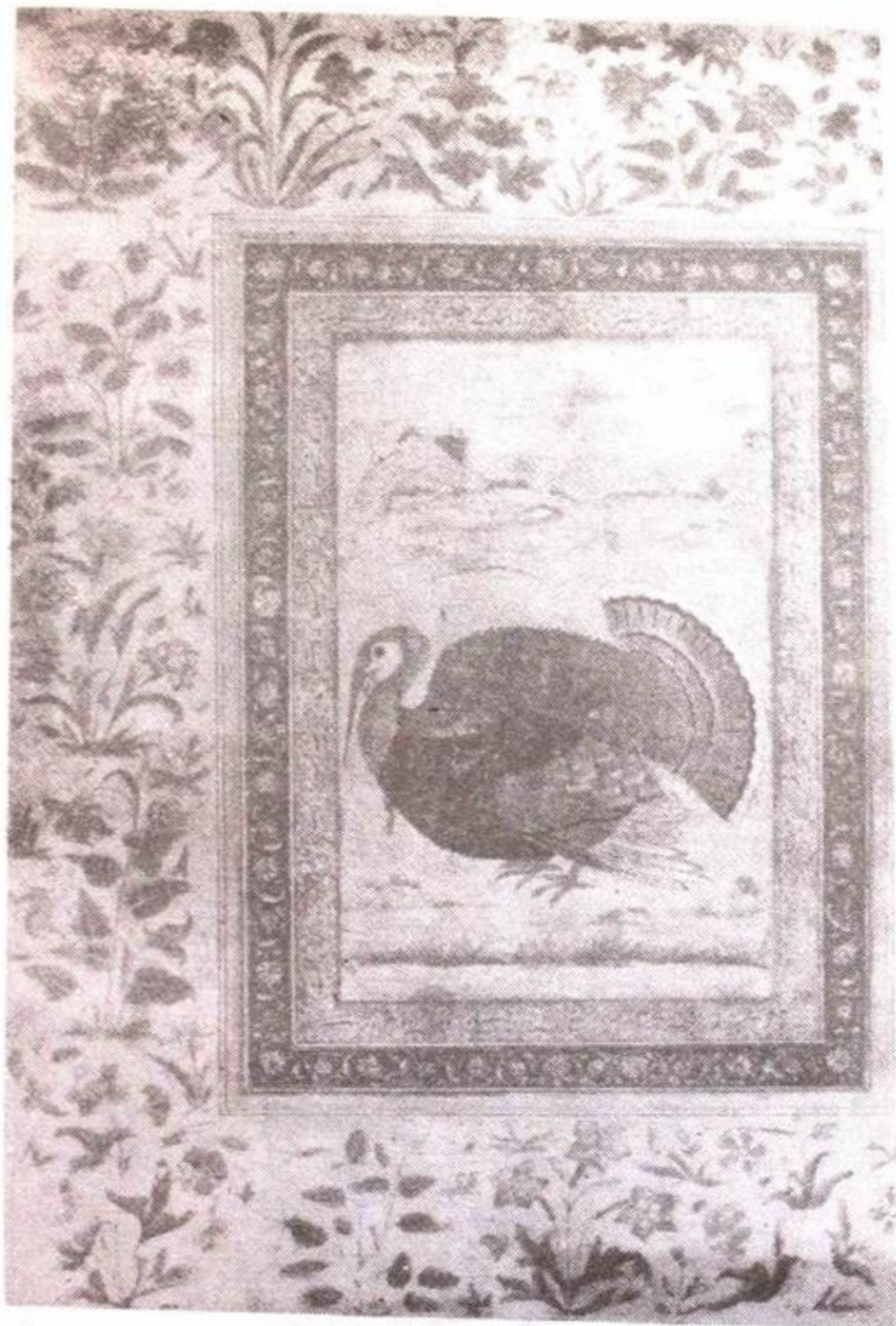
جہانگیر کے عہد کی ایک نادر تصویر۔ ایک مرغ ہے۔ حاشیہ میں گلکاری ہے۔
اندرونی حاشیہ میں باریک لفظوں میں فارسی کی نظم تحریر ہے۔ اور اوپر
بائیں جانب جہانگیر کی مہر کندہ ہے۔ (۱۶۰۵–۱۶۲۷)
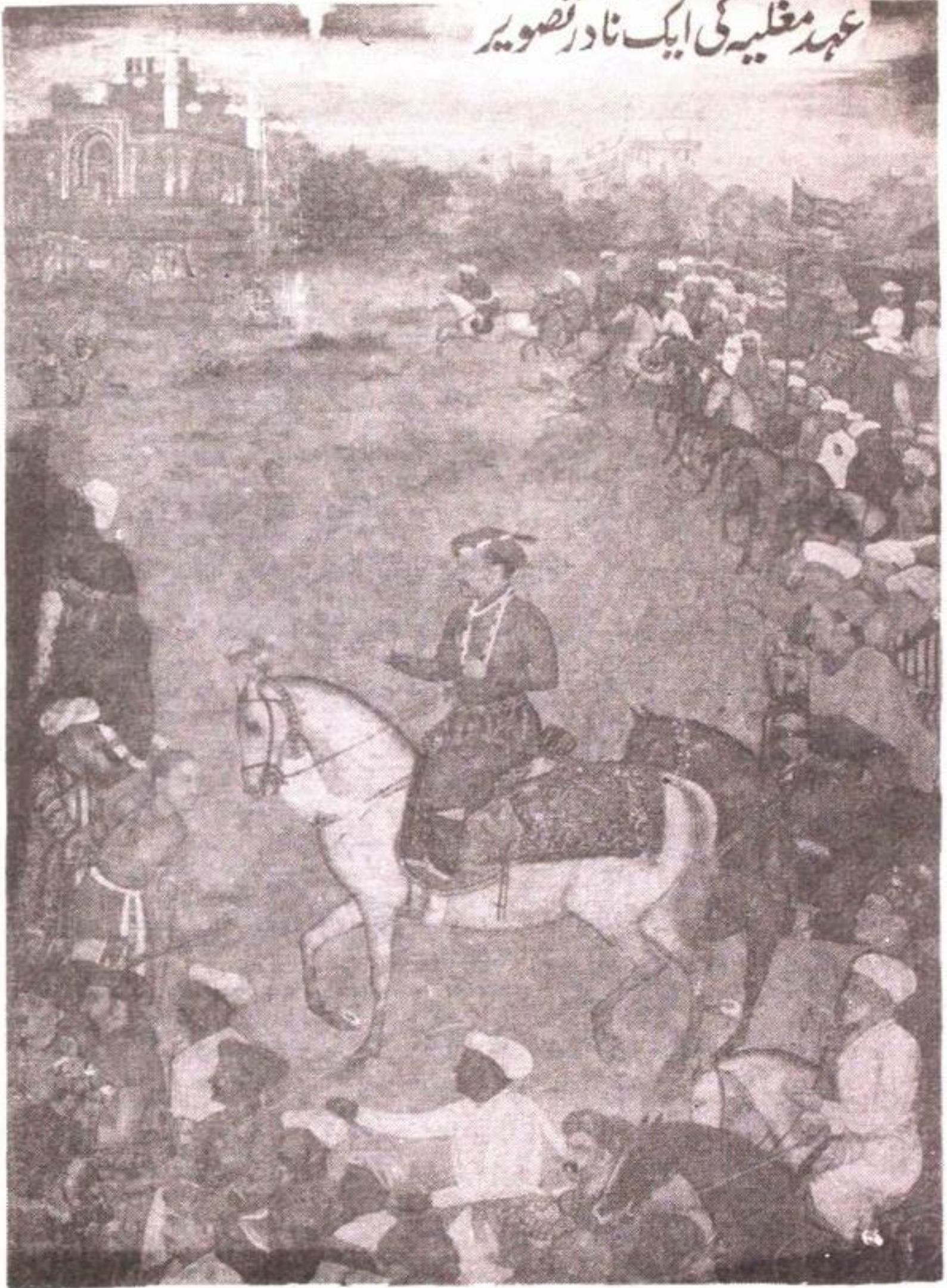
تصویر کی تفصیل اگلے صفحات پر

تصویر کی تفصیل

مغل عہد کی فن مصوری کا یہ نادر نمونہ ہے۔ جہانگیر گھوڑے پر سوار ہے اور جس کے ارد گرد امرا، گھوڑ سوار، سرکاری افسران اور ہاتھی اور خادم کھڑے ہیں۔ پس منظر میں اکبر کا مقبرہ ہے جو سکندرہ میں واقع ہے۔ جہانگیر تزک میں لکھتا ہے کہ وہ دو مرتبہ اپنے باپ کے مزار پر گیا۔ ایک بار آگرہ سے پیدل چلکر گیا۔ اور دوسری بار گھوڑے پر۔ مؤرخین کے لیے یہ تصویر ایک معمہ بنی ہوئی تھی کیوں کہ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ یہ تصویر کس واقعہ کو بیان کرتی ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد نے اس گتھی کو سلجھا دیا۔ جنھوں نے اپنے ایک مضمون میں اس تصویر کے بارے میں لکھا ہے کہ جب اس کے بڑے بیٹے خسرو نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کی اور وہ آگرہ سے فرار ہوگیا۔ بادشاہ نے تب باغی شہزادہ کو گرفتار کرنے کے لیے ایک افسر بھیجا۔ اس کے بعد وہ خود بھی شہزادہ کا پیچھا کرنے کے لیے روانہ ہوگیا۔ جہانگیر مزید لکھتا ہے۔

> "جب میں سکندرہ پہنچا تو مجھ سے اپنے باپ کا مقبرہ دیکھے بغیر نہ رہا گیا۔ راستہ میں کچھ لوگ مرزا شاہ رخ کے بیٹے مرزا حسن کو میرے روبرو لائے انھوں نے اسے گرفتار کیا تھا کہ وہ خسرو سے مل گیا تھا اور اس کی مدد کر رہا تھا۔ اس نوجوان سے جب میں نے سوالات کیے تو اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اس لیے میں نے اسے بندھوا کر ہاتھی پر بٹھانے کا حکم دیا۔"

اس واقعہ کو اس تصویر میں دکھایا گیا ہے۔ تصویر میں نوجوان نہایت گھبرایا ہوا اور افسردہ ہے۔ اسے اچانک پکڑا گیا ہے اور اتنی مہلت بھی نہ مل سکی کہ پگڑی سر پر رکھ سکتا۔ پیچھے کھڑا ہاتھی کہانی کو مکمل کر دیتا ہے۔

تزک میں درج ہے جہانگیر نے حکم دیا تھا کہ اس کے عہد کے اہم واقعات کو

مصوّر کیا جائے۔ یہ تصویر بھی تزک کے مسوّدہ کا حصّہ رہی ہوگی مگر کسی نے اسے وہاں سے پھاڑ لیا اور سیاق و سباق سے الگ ہوکر یہ معمہ ہوگئی ہے۔ اگرچہ تصویر پر آرٹسٹ کا نام نہیں ہے۔ قیاس یہ ہے کہ اسے مغل اسکول کے آرٹسٹ مرزا ابوالحسن المعروف مرزا زمان (نادرالزمان) نے بنایا ہوگا۔ یہ تصویر کئی رنگوں میں ہے۔ اس کی بنائی ہوئی اسی طرح کی دوسری تصویریں بھی ملتی ہیں۔ ابوالحسن کی بنائی جہانگیر کی ایک تصویر بھی اسی کتاب میں شامل ہے۔
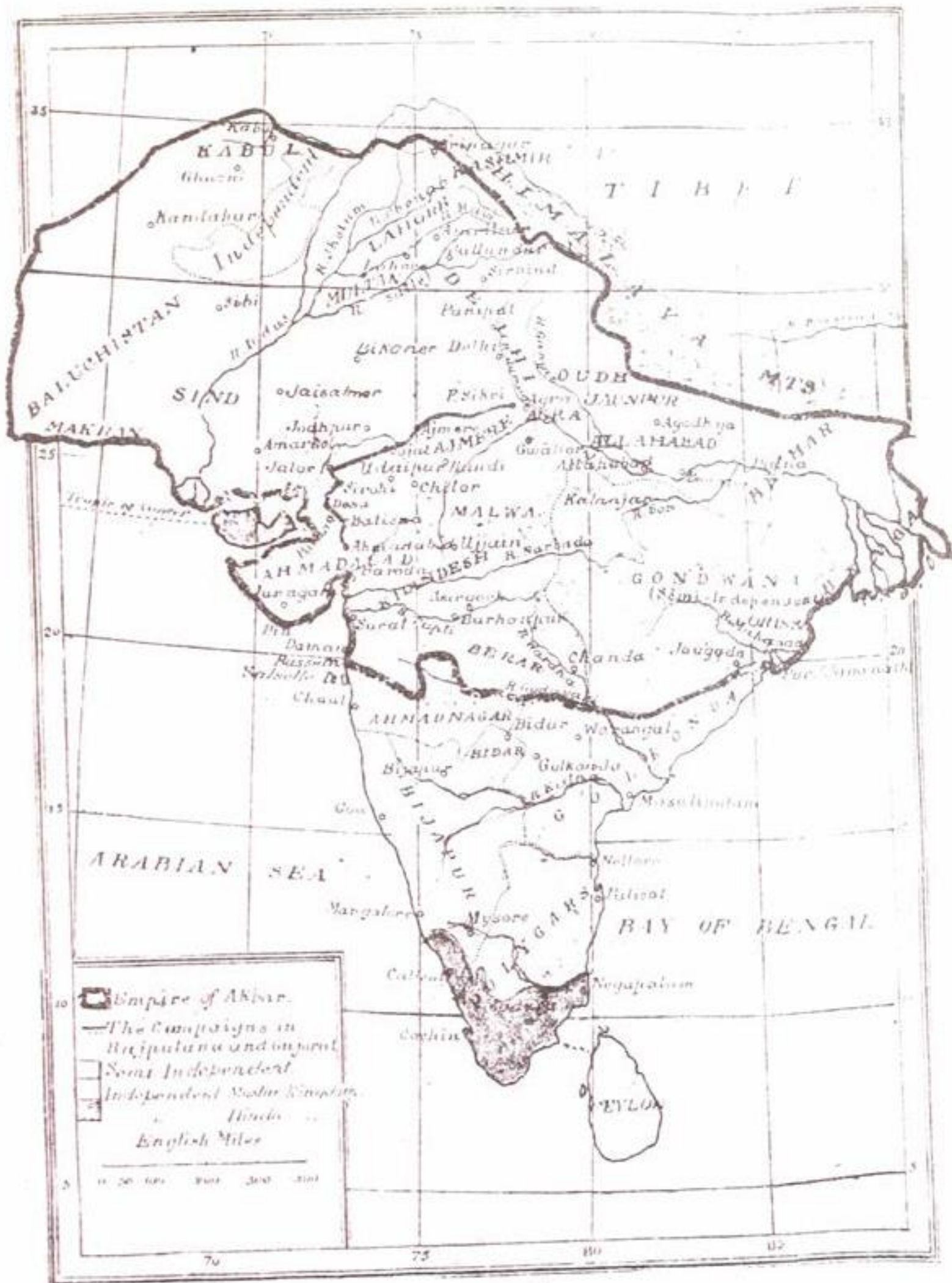
ہندوستان اکبر کی موت کے وقت

(۱)

تہذیبی پس منظر

عبدالرحیم خانخاناں مغلوں سے نسلی اور خاندانی رشتہ رکھتے تھے۔ وہ ان کے گھرانہ کے ایک فرد تھے۔ اس لیے مغلوں کی تہذیبی میراث میں ان کا بھی حصّہ تھا۔ ایک ہی تہذیب کے پروردہ ہونے کی وجہ سے' رحیم بھی مغلوں کے طرز فکر میں رنگے تھے۔ اور انہیں اپنے عہد کی ایک بہترین نمائندہ شخصیت کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ رحیم کو سمجھنے کے لیے مغلوں کے تہذیبی پس منظر کو سمجھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

وسط ایشیا کی دو عظیم شخصیتوں چنگیز خاں اور تیمور لنگ کی خاندانی خصوصیات مغلوں کو ورثہ میں ملی تھیں ہندوستان میں وہ ان کے سچے جانشین تھے۔ منگولوں نے بعد میں اگرچہ اسلام قبول کر لیا تھا لیکن ان کے یہاں اسلام کی جڑیں بہت گہری نہیں تھیں۔ وہ اپنے قبائلی رسم و رواج کے پابند تھے اور سیکولر طرزِ فکر رکھتے تھے۔ آزادئ فکر کے حامی تھے۔ جستجو اور مہم جوئی ان کی فطرت تھی۔ وہ کسی خاص عقیدہ سے بندھکر رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بیگنزم ان کے مزاج کا حصّہ تھا۔ چنگیز خاں نے لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ وہ ایک ظالم اور خونخوار حکمراں مشہور ہے۔ وہ انسانی جانوں کا دشمن تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ اعلیٰ درجہ کی انسانی خوبیوں کا بھی حامل تھا۔ بدھ مذہب کی اصطلاح میں اسے شمن (SHAMAN) کہا جاتا تھا جس کا مطلب تھا سادھو۔ وہ خدا پر یقین رکھتا تھا۔ مگر رسم و رواج میں نہیں۔ دوسرے مذاہب کا احترام کرتا تھا۔ کعبہ کی زیارت کے لیے جانا اسے پسند نہیں تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ تمام دنیا خدا کا گھر ہے اور عبادت کہیں بھی کیجیے اس تک پہنچ جاتی ہے۔ منگول رواداری' انصاف اور نظم و ضبط کو پسند کرتے تھے۔ وہ علم و ادب کا بھی ذوق

رکھتے تھے اور عالموں اور دانشوروں کی سرپرستی کرتے تھے۔ ان کی فوج میں ہر فرقے کے لوگ ملازم تھے۔ ہلاکو خاں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی لیکن اس نے حضرت علیؓ کے مزار کی بھی حفاظت کی۔

چنگیز خاں کے پوتے کبلی خاں نے ۱۲۶۹ء میں روم کے پوپ کے پاس ایک مشن بھیجا تھا اور یہ درخواست کی تھی کہ عیسائی علما اس کے دربار میں بھیج دیے جائیں تاکہ وہ ان سے استفادہ کر سکے اور مشرق و مغرب میں دوستی قائم ہو سکے۔ مگر چونکہ پاپائیت اپنے اندرونی انتشار کا شکار تھی اس لیے عیسائی اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکے ورنہ تو آج تمام منگول عیسائی ہوتے۔ یہ کبلی خاں تھا جس نے تمام مذاہب کی ایک کونسل بلائی تاکہ وہ ان کی بہترین تعلیمات سے واقف ہو سکے۔ بدھ، عیسائی اور مسلمان بھی اس کونسل میں شریک ہوتے تھے۔

اسی طرح کی کونسل اشوک اعظم نے بلائی تھی اور جب اکبر اعظم نے عبادت خانہ قائم کیا تو وہ اپنے اجداد کی روایت کو ہی زندہ کر رہا تھا۔ سچائی کی یہ جستجو اکبر کو ورثہ میں ملی تھی۔ یہ کہنا بھی درست ہے کہ منگول اگر اسلام قبول کرنے سے پہلے ہندوستان آتے ہوتے تو ہندو مذہب اختیار کر لیتے۔ انھیں ایک مذہب کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی وہ گئے وہاں کا مذہب اختیار کر لیا۔ چین میں بدھ مذہب کے پیروکار بن گئے۔ وسط ایشیا میں مسلمان ترکوں کے تعلق میں آتے تو اسلام قبول کر لیا۔ روس کے یوکرین علاقہ میں ان کا سابقہ عیسائیوں سے پڑا تو وہ عیسائی ہو گئے۔ گو نظریاتی طور پر انھوں نے کوئی نہ کوئی مذہب قبول کر لیا تھا تاہم ان کی پیگن خصوصیات۔ آزادیٔ فکر۔ رواداری۔ انصاف پسندی۔ روحانی اور رومانی مزاج اور علم و ہنر سے وابستگی ان کی شخصیت کا حصہ بنی رہیں۔

تیمور لنگ سے مغلوں کا ددھیالی اور چنگیز خاں سے ننھیالی رشتہ تھا۔ تیمور ترک تھا اور منگولوں کی طرح چغتائی ترک بھی اسلام قبول کرنے سے بیشتر پیگن (لامذہب) تھے۔ اسلام قبول کرنے کے باوجود وہ اپنے قبائلی طریقوں پر قائم رہے۔ تیمور ایک عظیم فاتح تھا اور پورا یورپ اس سے ڈرتا تھا۔ لیکن وہ ایک صوفی منش انسان تھا۔ جنگوں کے دوران درویش اس کے ساتھ ہوتے جن سے وہ شام میں نصیحتیں سنتا تھا۔ کیمپوں میں

شعروشاعری کی محفلیں منعقد ہوتیں ۔ یہ لوگ خود بھی شعر کہتے تھے اور کتابوں سے دلچسپی رکھتے تھے ۔تیمور راتوں میں کتابیں پڑھواکر سنتا تھا ۔ وہ سُنّی مذہب کے ماننے والے تھے لیکن سیاسی مصلحتوں اور ضرورتوں کی وجہ سے اہل تشیع کے ساتھ سمجھوتے کرنے پر مجبور ہوتے ۔اس لیے شیعی اثرات ان پر غالب رہے ۔ بابر اور ہمایوں دونوں اپنے سیاسی اقتدار کے لیے شیعوں کے مرہون منت تھے ۔ شراب نوشی ان کی فطرت ثانیہ تھی ۔ بابر چاندنی راتوں میں حوض شراب سے بھر لیتا تھا اور یہ شعر گنگناتا

ع نوروز و نو بہار، مئے دلبرے خوش است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

تیمور اپنے خطوں میں خود کو "بندۂ خدا" لکھتا تھا اور وہ اپنے کو زمین پر خدا کا نمائندہ سمجھتا تھا ۔ خلیفہ اور کعبہ جیسے مرکزی اسلامی اداروں کا اس کے دل میں کم ہی احترام تھا ۔

منگولوں کے یہ وارث جب ہندوستان آئے تو اسلام قبول کیے ہوئے ان پر دو سو سال کی مدّت بیت چکی تھی ۔اپنی اسلامی خصوصیات کے ساتھ ساتھ وہ بہت سے علاقائی رسم و رواج اپنے ہمراہ لیکر آئے تھے ۔ان کے عادات واطوار اسلام سے زیادہ ایران اور ترکستان کی علاقائیتوں میں رنگے ہوتے تھے ۔ ادھر ہندوستان میں اسلام کو آئے ساڑھے تین سو سال بیت چکے تھے اور ہندوستانی ماحول میں اسلام بہت سی تبدیلیوں سے گزر چکا تھا ۔ہندو مسلم تہذیبوں کا باہمی لین دین ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں نظر آتا تھا ۔

ہندوستانی فضا میں اب اسلام اجنبی نہیں رہ گیا تھا ۔ مختلف فرقوں کے ایک ساتھ ملکر رہنے سے ایک ملی جلی تہذیب کے آثار نمایاں ہو رہے تھے ۔ صوفی سنتوں کی تعلیمات کے زیر اثر ایک مشترکہ تہذیب جنم لے رہی تھی اور ہندوستان کے مختلف خطوں میں نئی بولیاں فروغ پا رہی تھیں ۔

لسانی سطح پر جو تجربے ہو رہے تھے وہ بڑے اہم تھے اور ان سے تہذیبی ہم آہنگی میں بڑی مدد مل رہی تھی ۔ فارسی سرکاری زبان تھی ۔ شاید قلعہ کے اندر ابھی بھی ترکی بولی جاتی تھی ۔ لیکن عوام میں برج بھاشا کا رواج بڑھ رہا تھا جو ہندی اور ہندوی کہلاتی تھی ۔ شہزادے، امراء اور خود بادشاہ کو بھی اس زبان سے لگاؤ

تھا اور فیشن کے طور پر بولتے تھے۔ دسویں و گیارہویں صدی میں خواجہ مسعود سعد سلمان جس زبان میں شاعری کر رہا تھا اور تیرہویں صدی میں جسے امیر خسرو نے نکھار اور سنوارا وہ زبان پندرہویں و سولہویں صدی میں تخلیقی اظہار کا اہم ذریعہ بن چکی تھی۔ اسی زبان میں بہت سی مثنویاں لکھی گئیں۔ مُلّا داؤد نے چنداین لکھی۔ ملک محمد جائسی نے پدماوت تخلیق کی۔ قطبن نے مرگاوتی اور منجھن نے مدھومالتی لکھی۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی اسی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ الکھداس تخلص تھا۔ رشدنامہ ان کے دوہوں کے مجموعہ کا ہے۔ ان کی خانقاہ میں ہر صبح پرانیام ہوتا تھا۔ یہ سب مسلمان صوفی تھے۔ بلند پایہ عالم تھے۔ شریعت کے پابند لیکن ان کی شاعری میں بھگتی کے عناصر بھی شامل تھے۔ متذکرہ مثنویوں میں ہندوستانی تہذیب و تمدن اور رسم و رواج کی زندہ تصویریں ملتی ہیں۔ سبھی مثنویں کا موضوع جیسا کہ ناموں سے ظاہر ہے ہندو کہانیاں ہیں۔ مثنوی کی ترتیب اس طرح ہے کہ حمد سے آغاز ہوتا ہے۔ حضرت پیغمبر اسلام کی مدح ہے۔ اس کے بعد خلفائے راشدین۔ حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کی تعریف ہے اور پھر اپنے مرشد کی تعریف میں کچھ بند لکھے گئے ہیں۔ پھر بادشاہ وقت کی شان میں مدح ہے اور ان سب کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے جس کے بیان میں ہندوستانی رسم و رواج جغرافیہ اور تاریخ کا بھی ذکر ہے۔

اُدھر بھگتی تحریک بھی ایک مشترکہ قومی تہذیب کے فروغ میں معاون ثابت ہو رہی تھی۔ کبیرا اور نانک کے نغمے فضا میں گونج رہے تھے۔ دادو دیال اور رحیم، چیتنیہ، تلسی داس اور سور داس بھگتی تحریک کے اہم رکن تھے۔ یہ لوگ تھے جو محبت۔ رواداری۔ انسانیت دوستی۔ اور مذہب کی روحانی قدروں کو فروغ دے رہے تھے۔ یہ تحریک صرف ہندی زبان یا شمالی ہند تک محدود نہ تھی بلکہ ملک گیر تھی۔ دکن میں دکنی۔ بنگال میں بنگالی۔ مشرق میں اودھی۔ مہاراشٹر میں کونی یا دکنی۔ راجستھان میں راجستھانی۔ سندھ میں سندھی۔ گجرات میں گجراتی زبانوں کا فروغ ہو رہا تھا اور ان میں مسلمان صوفی اور ہندو بھگت اعلیٰ پایہ کا ادب تخلیق کر رہے تھے۔

مرکز کے علاوہ ہندوستان کے دور دراز صوبوں میں بھی ایک مشترکہ قومی کلچر پروان چڑھ رہا تھا۔ بلکہ اشتراک و امتزاج کا عمل صوبوں میں زیادہ تیز تھا اور اس کا رنگ زیادہ گہرا تھا۔ دلی سلطنت کا شیرازہ منتشر ہو جانے پر بہت سے صوبوں

میں مسلمانوں نے آزاد اور خود مختار حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ ان ریاستوں کے حکمراں اور درباری مقامی مسلمان تھے اور جو غیر ملکی تھے وہ بھی شادی بیاہ کے ذریعہ علاقائیت کے رنگ میں رنگ گئے تھے۔ انہیں عوام کی حمایت حاصل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب مغلوں نے ان مسلم ریاستوں پر حملہ کیا اور انھیں اپنی مملکت میں ملانا چاہا تو مغلوں کو زبردست مزاحمت اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سندھ ہو یا گجرات یا دکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو سپاہیوں اور عوام نے اپنے مسلمان آقاؤں کے لیے مغلوں کے حملوں کے خلاف جان کی بازی لگا دی۔ سندھ میں مرزا جانی، گجرات میں مظفر گجراتی، دکن میں ملک عنبر اور چاند بی بی نے مغلوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ مغلوں کو ان مقامی سورماؤں کے خلاف مہم جوئی میں پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دکن کا بیشتر حصّہ تو اخیر تک فتح نہ ہو سکا۔ مغل ان حکمرانوں کی مزاحمت کو بغاوتوں اور سرکشیوں کا نام دیتے تھے جبکہ دراصل یہ عوامی تحریکیں تھیں اور ان کے لیڈر عوامی لیڈر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ متذکرہ جاں باز پیہم شکستوں کے باوجود بار بار اپنی طاقت مجتمع کر کے سامنے صف آرا ہو جاتے تھے۔ ان کی مہمات کا حال اس کتاب میں تفصیل سے دیا گیا ہے۔

یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ اس انتشار سے ہندو فائدہ اٹھا کر اپنی حکومت قائم نہیں کرتے۔ کیونکہ مذہبی امتیاز اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو بھائی سمجھتے تھے۔ بہمنی سلطنت پر محمود گاواں کے خلاف ہندو اور مسلمان دونوں ملکر لڑے کیونکہ دونوں ہی اسے باہری آدمی سمجھتے تھے۔ تیمور کے خلاف ہندو اور مسلمان دونوں نے ملکر مورچہ لیا۔ ہندو چاہتے تو یہاں اپنی حکومت قائم کر سکتے تھے۔ ہیمو بقال نے تو اپنے سوری آقا عادل شاہ کے لیے مغل سلطنت کا تختہ ہی اُلٹ دیا تھا۔ اگر بیرم خاں بروقت مداخلت نہ کرتا تو آج ہندوستان کی تاریخ دوسری طرح لکھی جاتی۔

ان صوبائی حکمرانوں کی سرپرستی میں مقامی کلچر اور زبان کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ مشترکہ کلچر کی چھاپ نہ صرف وہاں کے ادب بلکہ فن تعمیر، مصوری رقص و موسیقی اور رہن سہن میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس عہد کے فن تعمیر کو دیکھنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مقامی عناصر باہر سے آتے تمدن پر کس طرح اثر انداز ہو رہے تھے۔

اور مقامی ماحول کس طرح غیر ملکی اثرات قبول کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گجرات کا فن تعمیر دکن کے فن تعمیر سے مختلف ہے اور جون پور کا فن تعمیر سندھ کے فن تعمیر سے مختلف اور مرکز اپنا ہی جداگانہ رنگ رکھتا ہے۔

اکبر اور جہانگیر کے عہد کو ہندوستانی سماج کی نشاۃ ثانیہ کا عہد کہا جاسکتا ہے جس میں مذہبی رواداری، تہذیبی ولسانی ہم آہنگی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اکبر جیسی شخصیت اچانک پیدا نہیں ہو جایا کرتی۔ وہ اپنے عہد کا پروردہ تھا۔ صدیوں کی تہذیبی خصوصیات اس میں سمٹ آئی تھیں۔ اس نے اپنی سیاسی بصیرت سے اُبھرتی ہوئی نئی طاقتوں کو مزید منظم کیا اور انہیں نئی طاقت عطا کی۔ رحیم بھی اسی ماحول کا پروردہ تھا۔

اکبر اگرچہ ایک صوفی منش انسان تھا۔ تنہائی پسند، غور وفکر میں ڈوبا رہنے والا۔ رات رات بھر عبادت کرتا تھا۔ وسیع النظر اور فراخ دل تھا۔ وہ مزاجاً دروبین تھا۔ یا ہُو یا ہادی کا وظیفہ پڑھتا تھا۔ مذہبی کٹڑپن اس میں نام کو بھی نہیں تھا۔ انتظامی امور میں بھی اس کے فیصلے ہندو مسلم کی بنیاد پر نہیں ہوتے تھے بلکہ صحیح یا غلط اس کا پیمانہ تھا۔ ہندو اور شیعی اثرات بھی اس نے قبول کر لیے تھے۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ سنّی تھا اور اس کی ابتدائی زندگی میں کٹر سنّی علما کا بڑا عمل دخل رہا۔ وہ ذہنی ارتقار کی کئی منزلوں سے گزرا ہے۔ ابتدا میں وہ انتظامی امور میں کٹر سنّی علما کے فیصلوں کو نظر انداز اور ان کے اثر سے اپنے کو آزاد نہیں کر سکا۔ یہ علما کئی بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ مغلوں کے زمانہ میں صدر۔ قاضی۔ میر عادل اور مفتی کے عہدے خاص اہمیت کے حامل تھے اور ان پر علما کا ہی تقرر کیا جاسکتا تھا اور وہ بھی سُنّی علما کا۔ چونکہ اکثریت کا مسلک یہی تھا۔

اکبر نے شیخ عبدالنبی کو صدر الصدور کا عہدہ دیا تھا۔ انھیں وزیر مذہبی امور سمجھنا چاہیئے۔ وہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے نواسے تھے۔ عوام وخواص پر ان کے علم کی دھاک تھی۔ ابتدائی زندگی میں تصوّف کی جانب مائل تھے۔ لیکن بعد میں احادیث کی طرف زیادہ رجحان ہو گیا۔ اس کی وجہ شاید عربوں سے ان کا تعلق تھا کیونکہ یہ تبدیلی ان میں کئی حج کرنے کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ ان کی غیر معمولی

قوت و طاقت کا راز ان کا عہدہ تھا۔ اوقاف ان کے انتظام میں تھے۔ اس کے لیے وہ مدد معاش یا سیورغال کے بھی انچارج تھے۔ بادشاہ جس کو نقد روپیہ دیتا تھا اسے وظیفہ کہتے تھے لیکن یہ مدد اگر زمین کی صورت میں ہوتی تو اسے سیورالغال یا مدد معاش کہا جاتا تھا۔ سیورالغال کی تقسیم کا کام صدر کے ذمہ تھا۔ اسی لیے عبدالنبی کے دروازہ پر علما و فضلا۔ دانشوروں اور ضرورتمندوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ انھوں نے بڑی فراخدلی سے زمینیں تقسیم کیں۔ اسی لیے ان کے اثر و رسوخ کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔

بادشاہ پر بھی ان کا بہت اثر تھا۔ ان کی تعلیمات کے زیر اثر اکبر مسجد میں جھاڑو لگاتا۔ اذان دیتا اور نماز پڑھاتا تھا۔ شیخ مجلس سے اُٹھ جاتے تو بادشاہ انھیں جوتے لاکر پہناتا تھا۔ ایک بار تخت نشینی کی سالگرہ کے موقعہ پر بادشاہ کپڑوں پر زعفرانی رنگ چھڑک کر دربار میں آیا تو شیخ نے اسے تنبیہ کی اور اپنی چھڑی سے بادشاہ کے کپڑوں پر ضرب لگائی۔ بادشاہ کو غصہ آیا مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ البتہ بعد میں ماں سے شیخ کی شکایت کی۔ ماں نے بیٹے سے کہا۔ بیٹا! دل چھوٹا مت کر۔ یہ واقعہ تیری نجات کا باعث بنے گا۔ اس کے علاوہ قیامت تک اس بات کا چرچا رہے گا کہ ایک معمولی آدمی نے بادشاہ کی شان میں گستاخی کی اور بادشاہ پھر بھی خاموش رہا۔

لیکن شیخ بہت جلد بادشاہ کی نظروں سے گر گئے۔ ان پر کئی طرح کے الزامات عائد ہوتے۔ کئی واقعات ایسے ہوتے جن کی وجہ سے بادشاہ ان سے ناراض ہو گیا۔ متھرا میں ایک برہمن تھا جس کے بارے میں یہ شکایت آئی کہ اس نے زیر تعمیر مسجد کا ملبہ چرا لیا اور پیغمبر اسلام کی شان میں بھی گستاخی کی۔ شیخ نے برہمن کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ اسے گرفتار کر کے دربار میں لایا گیا۔ شیخ نے فیصلہ سنایا کہ برہمن کو پھانسی دیدی جاتے۔ جرم اتنا سنگین نہیں تھا۔ اس فیصلہ سے دربار میں بے چینی پھیلی۔ بادشاہ خود بھی اس فیصلہ کے حق میں نہیں تھا۔ بیگمات بھی پھانسی کے خلاف تھیں۔ اور انھوں نے بادشاہ سے سفارش بھی کی کہ برہمن کو چھوڑ دیا جاتے۔ لیکن شیخ اپنے فیصلہ پر اٹل رہے اور فیصلہ کے جواز میں بادشاہ کو دس حدیثیں سنائیں۔ اکبر نے عبدالقادر بدایونی سے رجوع کیا۔ بدایونی نے کہا کہ برہمن کو شک کا فائدہ دیکر رہا کیا جا سکتا ہے اور اس کے جواز میں ایک حدیث بھی پڑھ کر سنا دی لیکن شیخ اپنے فیصلہ

کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوا اور بادشاہ کی مرضی کے خلاف برہمن کو پھانسی دیدی گئی۔

ایک اور واقعہ ہوا۔ اکبر اپنے بارے میں کثرت ازدواج پر شریعت کی مہر لگانا چاہتا تھا۔ اس کا یہ بھی جذبہ تھا کہ اپنی ذاتی زندگی میں شرعی احکام کی پابندی کرے۔ اسی لیے وہ پہلا مغل بادشاہ تھا جس نے شراب پینا بھی ترک کر دیا تھا۔ پیتا بھی تھا تو بہت کم۔ ایک سے زائد شادیوں کے سلسلہ میں اکبر نے شیخ سے فتویٰ طلب کیا۔ شیخ نے کہا بادشاہ کو چار سے زائد شادیاں کرنے کی بھی شرعی اجازت ہے۔ لیکن عبادت خانہ کے ایک مذہبی مذاکرہ کے دوران انھوں نے کہا کہ اسلام میں بادشاہ کو چار سے زائد شادیاں کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ سن کر بادشاہ بہت ملول ہوا۔ اس نے شکایت کی کہ دیکھو شیخ کے فتوہ کی وجہ سے میں گناہ کا مرتکب ہوا۔

شیخ پر یہ بھی الزام تھا کہ انھوں نے اپنے عہدہ کا ناجائز استعمال کیا تھا اور خود بہت سا روپیہ غبن کیا تھا۔ بادشاہ نے بہت سا روپیہ حج کے موقعہ پر غربا میں تقسیم کے لیے شیخ کو دیا تھا۔ انھوں نے اس کا بھی حساب ٹھیک سے نہیں دیا۔ شاید ان الزامات میں مبالغہ زیادہ ہو۔ ان کو بدنام کرنے کی بھی سازش کام کر رہی تھی۔ کہا جاتا ہے حساب کتاب کے معاملہ میں وہ لاپرواہ زیادہ تھے۔ ان کا طریقہ کار بھی غیر رسمی تھا۔ ان کی ان کمزوریوں سے ان کے ماتحت عملہ نے فائدہ اٹھایا اور بدنامی حضرت شیخ کے کھاتہ میں لکھی گئی۔ لیکن ان کے خلاف الزامات کی تاریخی شہادت موجود ہے۔

اکبر کے دربار کے ایک اور عالم مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری تھے۔ وہ بھی عوام میں مقبول تھے اور بادشاہ پر بھی ان کا اثر تھا۔ سوری سلطان سلیم شاہ کے دربار میں انھیں شیخ الاسلام کا عہدہ دیا گیا تھا۔ سلطان انھیں اپنے برابر تخت پر بٹھاتا تھا۔ ہمایوں نے انھیں مخدوم الملک کا خطاب دیا تھا۔ عبدالنبی اور عبداللہ سلطان پوری دونوں عبادت خانہ کی مذہبی بحثوں میں سنی نقطہ نظر کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان پر بھی الزام تھا کہ انھوں نے اپنے درباری منصب سے ناجائز فائدہ اٹھا کر غیر معمولی دولت جمع کر لی تھی۔ انھوں نے حج کے خلاف فتوہ دیا تھا۔ کیونکہ مکّہ کے لیے سمندر سے سفر فرنگیوں کے جہازوں میں کرنا پڑتا تھا۔ اگر بہ راستہ خشکی سفر کیا جاتا تو شیعوں کی سرزمین سے ہو کر گزرنا ہوتا تھا۔ اس لیے انھوں نے حج کرنا ناجائز قرار دیدیا تھا۔

عبادت خانہ کی بحثوں کے دوران اُن پر یہ بھی الزام لگایا گیا کہ وہ زکوٰۃ نہیں دیتے۔ سال ختم ہونے سے پہلے اپنی ساری دولت بیوی کے نام پر منتقل کر دیتے ہیں اور دوسرا سال شروع ہونے پر اپنے نام کر لیتے ہیں اور اس طرح زکوٰۃ نہ دینے کا شریعی جواز پیدا کر لیتے ہیں۔ مخدوم الملک نے ہندوستان کو دارالکفر قرار دیدیا۔ اس کے علاوہ نہایت خودسرا ور مغرور تھے۔ نماز کا وقت ہو جاتا تو بھرے دربار میں وضو کرتے اور جان بوجھ کر درباریوں پر چھینٹیں اُڑاتے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ شیخ عبدالنبیؒ اور عبداللہ سلطانپوری دونوں ایک ہی مسلک سے تعلق رکھنے کے باوجود آپس میں لڑتے رہتے اور ایکدوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں لگے رہتے۔ ان کے باہمی جھگڑوں سے بھی اکبران دونوں سے متنفر ہو گیا۔ آخر دونوں کو معزول کر دیا گیا اور جلا وطن کر کے مکہ بھیج دیا گیا۔ بعد میں جب عبداللہ سلطان پوری کی املاک کی تفتیش کی گئی تو ان کے خاندانی قبرستان سے سونے کی سلّیاں برآمد ہوئیں جو قبروں میں چھپا کر رکھی تھیں۔

اکبر کے دربار میں زیادہ تر سنّی علما کا رویہ کٹ حجتی پر مبنی تھا۔ وہ جھوٹی شان اور ریاکاری میں مبتلا تھے۔ روایت پرست اور لکیر کے فقیر تھے۔ ان کا طرزِ عمل اخلاق اور تہذیب سے گرا ہوا تھا۔ اکبر حق کا جویا، کھلے ذہن کا مالک، وسیع المشرب، آزادیٔ فکر کا حامل، علما کی اس تنگ نظری سے متاثر نہیں ہو سکتا تھا۔ اور ہوا بھی یہی وہ بڑے اخلاص سے سنّی علما کی جانب بڑھا تھا مگر اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ دھیرے دھیرے سُنّی علما کے طبقہ سے دور ہوتا چلا گیا۔ سنّی علما کی کٹ حجتی کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے۔

اس زمانہ میں مہدویوں کو خارج از اسلام تصور کیا جاتا تھا۔ سیکڑوں مہدویوں کو علما کے فتوٰی پر قتل کیا گیا۔ اکبر کے عبادت خانہ کا ایک منظر ہے۔ بادشاہ کے سامنے مہدویوں کے خلاف مقدمہ پیش ہے۔ مصطفٰی گجراتی[1] بادشاہ سے کہتے ہیں۔

---

[1] مجلس حضرت بندگی میاں مصطفٰے گجراتی۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد دکن۔ ۱۹۴۷ء
میاں مصطفٰے گجراتی بوہرہ فرقہ سے تعلق رکھتا تھا اور سید محمد جونپوری (بقیہ اگلے صفحہ پر)

"مہدوی شیخ سے بحث کرنے کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ ہمارے لیے مکّہ کے عالموں کا فیصلہ کافی ہے ان کا فتویٰ مہدوی شیخ کو پھانسی پر چڑھانے کی مضبوط دلیل ہے۔

بادشاہ نے اس حقیر (مصطفیٰ گجراتی) سے پوچھا "کیا مکّہ کے علما گجرات آتے تھے؟"

حقیر نے جواب دیا "نہیں"

اس پر بادشاہ بولا۔ "کیا وہ (عرب علما) مہدویوں کے بارے میں جانتے ہیں"

حقیر نے جواب دیا "نہیں۔ وہ ان کے بارے میں نہیں جانتے ہیں"

بادشاہ نے حیرانی سے کہا "کیسے عجیب لوگ (عرب کے علما) ہیں نہ تو انھوں نے مہدویوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی اور نہ ان سے جواب طلب کیا اور نہ ہی وہ یہاں آکر ان سے ملے اور ان کے خلاف محض مہدویوں کے دشمنوں کی شکایت پر فتوہ جاری کر دیا۔ سچے عالموں کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے"

بادشاہ کی اس تقریر پر موجود علما ایک آواز ہو کر بولے۔

"اے مرزا! (بادشاہ) ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ مکّہ کے علما کیا جانتے ہیں اور کیا نہیں، ہمارے لیے ان کا فتوہ کافی ہے"

یہ سُن کر بادشاہ بہت برہم ہوا اور ایک عالم دین سے جو مجلس میں موجود تھے، مخاطب ہوا۔ "اے محترم! ایک مرتبہ تم نے مجھے بتلایا تھا کہ تمہارے والد مکّہ میں درس دیتے تھے اور وہاں انھوں نے بڑی عزت حاصل کی تھی لیکن دشمنوں نے ان کی شہرت سے جلکر ان پر رافضی ہونے کا الزام لگایا اور عرب کے علما نے ان کے خلاف فتوہ جاری کر کے انہیں مروا دیا تھا۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ ان پر جھوٹا الزام لگایا گیا تھا اور تمہارے والد بے قصور تھے کیا تم علما کے اس فتویٰ کو صحیح سمجھتے تھے"

(: پچھلے صفحہ کا بقیہ)

کا مرید تھا۔ اکبر بادشاہ نے اسے گجرات سے طلب کیا تھا اور مہدوی نظریات کے بارے میں اس سے معلومات حاصل کی تھیں۔

اس عالم کے پاس بادشاہ کی اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا مگر وہ پھر بھی بولے اور کہا "حضور! اگر آپ منافق اور بے دین لوگوں کے سامنے علمائے حق کو اس طرح ذلیل کریں گے تو پھر کوئی بھی ان کی عزت نہیں کرے گا۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔" اس عالمانہ محفل میں یہ احمقانہ جواب ہے۔ جب مکہ کے علما دشمنوں کے کہنے پر تمہارے والد کے خلاف فتویٰ جاری کر سکتے ہیں تو کیا وہ ایسا مہدویوں کے خلاف نہیں کر سکتے ؟" عالم دین خاموش ہو گیا۔

اس طرح کے واقعات نے اکبر کو سنی علما سے دور کر دیا۔ خود سنی علما پر جس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اسلام کی خدمت کا بہترین موقع انھیں ملا تھا جو انھوں نے گنوا دیا۔ اکبر کو ایک وسیع ترافق کی تلاش تھی۔ اس کی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا اس خلا کو اثنائے عشر نے پر کیا۔ اکبر نے بچپن سے شیعی ماحول میں پرورش پائی تھی — بیرم خاں جو شیعہ تھا اس کا اتالیق تھا۔ ابتدائی ایام حکومت میں بیرم خاں ہی اس کا وکیل سلطنت یعنی وزیر اعظم تھا۔ بیرم خاں کی بیوہ اس کے نکاح میں تھی۔ چنانچہ اکبر نے اپنے دو بیٹوں کے نام حسن اور حسین رکھے جو بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ اگرچہ مغل سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ایران کے زیر اثر آتے تھے جو ایک شیعہ حکومت تھی مگر بعد میں شیعہ مذہب مغلوں کی ضرورت بن گیا۔ تقلید پرستی کے برخلاف یہ عقل پرستی کا دور تھا۔ مذہبی امور میں جو شک وشبہ پیدا ہوتا تھا اس کا جواب دلیل سے دیا جاتا تھا۔ ایک متجسس ذہن مطمئن ہونا چاہتا تھا۔ شیعی حضرات اپنی تعلیم وتربیت اور اپنے تہذیبی ورثہ کے پیش نظر اس عہد کے لیے موزوں ترین لوگ تھے۔ وہ آزادی فکر کے حامل تھے۔ بات کو سلیقہ سے پیش کرنا جانتے تھے۔ سب سے بڑھکر اہلِ اقتدار حضرات کی تعریف وتوصیف کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ شیخ مبارک جو شیعہ تھے[1] اکبر کے دربار میں گجرات کی فتح کے جشن کے موقع پر حاضر ہوتے ہیں۔ بادشاہ سے پہلا تعارف ہے۔ صاحب کمال لوگوں کو اظہار خیال کا موقع حاصل ہے۔ اس موقع پر شیخ مبارک بھی تقریر کرتے ہیں۔ بولتے کیا ہیں بلکہ محفل کو لوٹ لیتے ہیں۔ گجرات کی فتح

---

[1] شیخ مبارک ایک زمانہ میں مہدوی سمجھے جاتے تھے۔ پھر وہ نقشبندی اور بعد میں شیعہ ہو گئے تھے۔ اس کے بعد دین الٰہی قبول کر لیا۔

پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے شیخ مبارک تجویز پیش کرتے ہیں کہ بادشاہ عوام کا روحانی پیشوا اور حاکم دونوں بن سکتا ہے۔ وہ امام اور سلطان دونوں کا رول ادا کرسکتا ہے۔ شاید شیخ نے اکبر کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ یہی تو وہ چاہتا تھا دربار واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اکبر نے شیخ کو گلے سے لگالیا۔ یہ وہی شیخ تھا جس کو عبدالنبی اور عبداللہ جونپوری نے مہدوی ہونے کا الزام لگا کر پھانسی لگانے کی تجویز پیش کی تھی۔ اس نے بادشاہ کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر اس کا دل جیت لیا تھا۔ چھ سال بعد محضر نامہ کی شکل میں اس تجویز کو عملی جامہ پہنا دیا گیا۔ جو اکبر کے عہد حکومت کا ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ اس محضر نامہ سے اکبر نے روایت پرست کٹر علما سے نجات حاصل کرلی۔

اکبر جب سُنّی علما سے بدظن ہوا تو اس نے شیعی علما کو بلایا جن میں تین بھائی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حکیم ابوالفتح، حکیم ہمایوں اور حکیم نورالدین جنھیں گیلان سے بلایا گیا تھا۔ اکبر خاص طور پر حکیم ابوالفتح سے بہت متاثر ہوا چونکہ بادشاہ جو کچھ کہتا تھا نہ صرف یہ کہ ابوالفتح اس کی تائید کرتا تھا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر بادشاہ کی مرضی کے مطابق بات کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے بادشاہ کا دل جیت لیا اور اس کا قریب ترین مصاحب بن گیا۔ اکبر نے قرآن کی تفسیر لکھنے کا حکم دیا۔ ابوالفضل جو فیضیؔ کا بھائی اور شیخ مبارک کا بیٹا تھا اکبر کے دربار میں آیۃ الکرسی کی تفسیر لیکر حاضر ہوا۔ شیخ مبارک اور ان کے دونوں بیٹوں کی وجہ سے دربار کے ماحول میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہوئی۔ انھوں نے سلطنت کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ اکبر کے اندر کا صوفی اور مدبر اپنی پوری توانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ اور بقول آر۔ ایس۔ ترپاٹھی مغل حکومت محض سیاسی نہ رہ کر ایک تہذیبی سلطنت میں تبدیل ہوگئی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملی جلی اس تہذیب کے پیچھے محرک کیا تھا۔ کون سا اصول اور نظریہ اس کے پیچھے کام کر رہا تھا۔ دراصل یہ ایک نظریاتی تحریک تھی۔ صوفی سنت جس کے مبلّغ تھے اور جس نے نظریہ وحدت الوجود کے بطن سے جنم لیا تھا اور جس کا بنیادی اصول تھا کہ سچائی تو ایک ہوسکتی ہے مگر اس تک پہنچنے کے راستے مختلف ہوتے ہیں۔ جس نے یہ سکھایا کہ انسان نہیں بلکہ اس کے گناہ سے نفرت کرو۔

اسلام میں صوفیوں کا یہ مسلک پہلی انقلابی تحریک تھی جس نے کل عالم انسانیت سے پیار کرنا سکھایا۔ جس نے دلوں کو ملانے کا کام کیا۔ اسلام کے دوست اور ہمدرد پیدا کیے۔ اس تحریک کی وجہ سے اسلامی فکر دو دھاروں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک دھارا روایت پرست راسخ العقیدہ مسلمانوں کا تھا تو دوسرا دھارا وجودیوں کا تھا جو آزادیِ فکر کے حامل تھے۔ ایک اہل شریعت کہلاتے تو دوسرے اہل طریقت۔ ایک اہل ظاہر تھے تو دوسرے اہل باطن۔ اور دونوں دھاروں کے ماننے والوں میں برابر کشمکش ہوتی رہتی تھی۔ یہ کشمکش عہد مغلیہ میں بھی نظر آتی ہے۔ البتہ اکبر نے وجودی قوتوں کا ساتھ دے کر تہذیبی جذب وانجذاب کے عمل کو تیز تر کر دیا تھا۔ چنانچہ اس تحریک کے نتیجہ میں متحدہ قومی تہذیب اپنے عروج پر پہنچ گئی جس کی جھلکیاں ہمیں اس عہد کے فنون لطیفہ۔ طرز معاشرت اور زبان وادب میں صاف نظر آتی ہیں۔ مولانا شبلی نے اکبر کے عہد کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

" (اکبر کی) ان کارروائیوں نے متعصب مولویوں کا زور توڑ دیا تھا اور اکبر کو موقع ملا کہ وہ ایک ایسی وسیع اور آزادانہ حکومت قائم کرے جس کے سایہ میں ہندو مسلمان، یہود و نصاریٰ آزادی کے ساتھ اپنے اپنے فرائض مذہبی ادا کر سکیں۔ اور یہی طرز حکومت خلفائے راشدین نے قائم کیا تھا۔"

یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مغل دور حکومت میں اصل قوت چاہے وہ اسلام ہو یا ہندوازم مذہب نہیں تھا بلکہ زبان اور کلچر زیادہ طاقتور محرکات تھے جو سماج میں کام کر رہے تھے۔ اگر مذہب اصل طاقت ہوتی تو اکبر اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے خلاف جنگی کارروائی نہ کرتا۔ تیمور لنگ کا حملہ بھی ایک مسلم حکومت پر تھا۔ مسلمان آقاؤں کی ہدایت پر ہندو سپہ سالار ہندو ریاستوں کے خلاف نبرد آزما نظر آتے ہیں اور ہندو آقا کے ایما پر مسلمان فوجیں، مسلمانوں سے ہی لڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

عہد مغلیہ کے زوال کے ساتھ صلح کل کی یہ تحریک کمزور پڑ گئی۔ اور رجعت پسند اور روایت پرست طاقتوں نے پھر سر اُبھارا۔ سیاسی زوال کا شاید یہ لازمی نتیجہ تھا۔ مسلمان اپنے کھوتے ہوئے اقتدار کو بحال کرنے کے لیے پھر پیچھے کی طرف لوٹ جانا چاہتے تھے۔ یہ ان کی مجبوری تھی۔ وہ تاریخ کے دھارے کو موڑ نہ سکے۔ تاریخ نے

یہ ثابت کیا ہے کہ پیچھے کی طرف لوٹ جانے کی اس حکمت عملی سے مسلمانوں کو نقصان ہی پہونچا۔ فائدہ کچھ بھی نہ ہوا بعد کے آنے والے مذہبی پیشواؤں کی تعلیمات کے نتیجہ میں مسلمانوں میں بنیاد پرستی پختہ ہو گئی اور مشترکہ تہذیب کا دھارا اُلٹ گیا۔ اگر تاریخ کا یہ بہت بڑا اگر ہے، مغلوں کے عہد میں پروان چڑھنے والی وجودی قوتیں کمزور نہ پڑتیں تو آج ملک کی تقسیم نہ ہوتی اور مسلمان برصغیر میں یوں تباہ و برباد نہ ہوتے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ انھوں نے آج بھی اپنی تاریخ سے کوئی سبق نہیں لیا ہے۔ تقسیم ملک کے سانحہ سے وہ پھر اپنے ہی خول میں سمٹ گئے ہیں اور تاریخ کے دھارے کو پیچھے کی طرف موڑنے کی سعی لاحاصل میں لگے ہیں۔

ہم نے اس کتاب میں جہاں عبدالرحیم خانخاناں کی جنگی اور سیاسی کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا ہے وہاں ان مشترکہ تہذیبی اور سیکولر تصویروں کو بھی جگہ جگہ ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ جو اس عہد کا طرۂ امتیاز تھیں۔

۲

بیرم خاں

عبدالرحیم خانخاناں بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ اس کے والد بیرم خاں کا شمار سلطنتِ مغلیہ کے معماروں میں ہوتا تھا۔ ہمایوں کی ہندوستان میں دوبارہ واپسی اور مغل حکومت کا استحکام بیرم خاں کا رہین منت تھا۔ مغل سلطنت پر یہ بڑا آزمائشی دور تھا۔ افغان اپنے کھوتے ہوتے اقتدار کو حاصل کرنے کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ افغانوں کی بغاوتوں کو کچلنے میں بیرم خاں نے اہم رول ادا کیا۔

بیرم خاں نسلاً ترک تھا اور مذہباً شیعہ۔ اس کا تعلق ترکوں کے ایک قبیلہ قراقونلو کی ایک شاخ بہارلو سے تھا۔ اس زمانہ میں ترک سماج قبیلوں میں تقسیم تھا۔ اور ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا۔ یہ لوگ کالی بھیڑ کو جھنڈے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس لیے انھیں کالی بھیڑ بھی کہتے تھے۔ لوٹ مار ان کا پیشہ تھا۔ انھوں نے اپنے سردار قرا یوسف اور اس کے بیٹوں کی رہنمائی میں ہمدان، کردستان اور دیناور کے علاقوں میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ بیرم خاں اسی قبیلہ کے ایک سردار شیر علی بیگ جسے پیر علی بیگ بھی کہتے ہیں کا پرپوتا تھا۔ جب "کالی بھیڑ" کے ہی ایک سردار اوزون حسن نے اس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تو شیر علی بیگ کو ابوسعید کی ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ مگر وہاں بھی وہ زیادہ دن نہیں ٹھہر سکا۔ وہاں سے بھاگ کر وہ کابل چلا گیا اور شیراز کے گورنر سے جنگ لڑی جس میں وہ ہار گیا۔ شیر علی اس جنگ میں قتل کر دیا گیا۔ اس کا بیٹا یار علی بیگ اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ کر قندوز میں آکر آباد ہو گیا۔ یہ شاہ اسماعیل صفوی کا دورِ حکومت تھا۔ بدخشاں میں اس نے امیر خسرو شاہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ جب امیر خسرو شاہ کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا گیا تو شیر علی بیگ بابر کی فوج میں داخل ہو گیا

اس وقت اس کا بیٹا سیف علی بیگ بھی اس کے ساتھ تھا۔ سیف علی بیگ کا جب انتقال ہوا تو وہ ترقی کرکے غزنی کا گورنر بن چکا تھا۔ بیرم خاں سیف علی بیگ کا بیٹا تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عبدالرحیم خانخاناں کا مغلوں کے ساتھ کئی نسلوں کا رشتہ تھا۔

بیرم خاں بدخشاں میں پیدا ہوا اور وہیں اس کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ سولہ سال کی عمر سے وہ بابر سے وابستہ تھا۔ اپنی فطری ذہانت، محنت اور پسندیدہ اطوار کی وجہ سے وہ بابر کا معتمد خاص بن گیا۔ شہزادہ ہمایوں بھی اس کے اوصاف سے متاثر تھا۔ بابر نے بیرم خاں کو اپنے بیٹے ہمایوں کا اتالیق مقرر کیا جس کی خواہش خود ہمایوں نے کی تھی۔

بیرم خاں ترقی کرکے سپہ سالار کے عہدہ تک پہنچ گیا۔ گجرات کی مہم میں چھپانیر کو فتح کرنے میں بیرم خاں نے ہمایوں کی مدد کی۔ قنوج کی تاریخی جنگ میں جہاں سے ہمایوں کو شیرشاہ سے شکست کھاکر بھاگنا پڑا تھا۔ بیرم خاں بھی ساتھ تھا۔ اس جنگ میں وہ بہادری سے لڑا۔ شکست کے بعد اس نے سنبھل کے راجہ متر سین کے یہاں پناہ لی۔ متر سین ہمایوں کا باج گزار تھا۔ شیرشاہ نے راجہ سے کہا کہ وہ اسے بیرم خاں کو واپس کردے۔ متر سین انکار نہیں کرسکا اور بیرم خاں کو شیرشاہ کے حوالہ کردیا۔ شیرشاہ اس کی بہادری کے قصے سُن چکا تھا۔ وہ اس کے ساتھ عزت سے پیش آیا اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا مگر بیرم خاں نے دوستی سے انکار کردیا اور وہاں سے نکل بھاگا۔ گوالیار کا گورنر ابوالقاسم اس کے ہمراہ تھا۔ راستہ میں شیرشاہ کی فوجوں نے انھیں گھیر لیا اور وہ دونوں گرفتار کرلیے گئے۔ ابوالقاسم بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ شیرشاہ کے افسروں نے اسے بیرم خاں سمجھ کر اس سے مخاطب ہوتے۔ مگر بیرم خاں نے کہا "بیرم خاں، وہ نہیں میں ہوں۔" ابوالقاسم نے کہا "یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میرا وفادار ہے اور میری زندگی بچانا چاہتا ہے اس لیے اپنے کو بیرم خاں کہہ رہا ہے۔" یہ سُن کر افسروں نے ابوالقاسم کو قتل کردیا۔ بیرم خاں فرار ہوکر گجرات کے سلطان محمود شاہ کے دربار میں پہنچا۔ وہاں سے وہ حج کے بہانہ سورت ہوتے ہوتے سندھ آگیا جہاں وہ پھر سے ہمایوں کے ساتھ آملا۔ ایران کے سفر میں بھی بیرم خاں ہمایوں کا دمساز و رفیق تھا۔ ایران کا بادشاہ طہماسپ صفوی

اس کی بہادری سے بہت متاثر ہوا اور اسے ’خان‘ کا خطاب عطا کیا۔

ایران سے واپسی پر ہمایوں نے افغانستان کو دوبارہ حاصل کیا اور بیرم خاں نے اس کی اس مہم میں مدد کی اسی دوران ہمایوں نے اسے ’خانخاناں‘ کا خطاب دیا۔ ہمایوں نے بیرم خاں کو اپنے بھائی کامران کے خلاف مہم پر بھیجا۔ بیرم نے اس سے قندھار واپس لے لیا اور کابل کو فتح کرنے میں بھی مدد کی۔ بعد میں جب بیرم خاں کو قندھار کا گورنر مقرر کیا تو ہمایوں نے شاہ ایران کو لکھا کہ اس نے بیرم کو قندھار کا گورنر اس لیے مقرر کیا تھا کہ وہ ہم دونوں کا وفادار تھا۔ لوگوں نے شکایت کی کہ بیرم خاں غدّاری کر رہا ہے۔ بعد میں ہمایوں نے چھان بین کی تو یہ الزام بے بنیاد پایا۔

۱۵۵۲ء میں ہمایوں تیرہ سال جلاوطن رہنے کے بعد دوبارہ ہندوستان کے تخت پر بیٹھا۔ اس بار اس نے اپنی پالیسی میں تبدیلی کی۔ ایک اہم قدم یہ اٹھایا کہ مقامی زمینداروں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ان کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کیے۔ میوات میں حسن خاں بڑا جاگیردار تھا۔ جس کا کافی اثر ورسوخ تھا۔ اس کا ایک چچازاد بھائی جمال خاں میواتی تھا جس کی دو خوبصورت بیٹیاں تھیں۔ اس نے اپنی ایک بیٹی کی شادی ہمایوں سے اور ہمایوں کے اصرار پر دوسری بیٹی کی شادی بیرم خاں سے کر دی۔ عبدالرحیم خانخاناں اسی میواتی بیگم کا بیٹا تھا۔

شیر شاہ کے انتقال کے بعد افغانوں کی طاقت منتشر ہو گئی تھی۔ مغلوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا اور بیرم خان نے ان کی بھرپور مدد کی۔ افغانوں اور مغلوں کے درمیان مچھی واڑہ (پنجاب) کے مقام پر ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں بیرم خاں نے افغانوں کو ہرا دیا۔ انعام میں اسے سنبھل کی جاگیر ملی۔ پنجاب گو کہ مغلوں کے قبضہ میں تھا مگر وہاں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ مغلوں کا مقرر کردہ گورنر شرارت پر آمادہ تھا۔ ہمایوں نے نوجوان شہزادہ اکبر کو پنجاب کا گورنر مقرر کر دیا۔ وہ تو بچہ تھا اور برائے نام گورنر تھا۔ حقیقی طاقت بیرم خاں کے ہاتھ میں تھی۔ جو اکبر کا اتالیق بھی تھا۔ پنجاب کی بدنظمی سے سکندر سوری فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اکبر اور بیرم خاں اس کی طاقت کو ختم کرنے میں مصروف تھے۔ مہمات کے دوران جب وہ گورداسپور ... کلانور مقام پر ڈیرے ڈالے ہوئے تھے تو ہمایوں دلّی میں حادثہ کا شکار ہو گیا وہ قلعہ کی

لائبریری کی سیڑھیوں سے گر پڑا۔ چوٹ سر پر لگی تھی۔ چار دن تک اس پر بیہوشی طاری رہی۔ اور پانچویں دن اس کا انتقال ہو گیا۔ ہمایوں کے انتقال کی خبر سُن کر امرا نے اکبر کی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور ۱۴ فروری ۱۵۵۶ء کو کلانور کے ایک باغ میں اس کی تاجپوشی کر دی گئی۔ اس وقت مغل سلطنت چاروں طرف خطروں سے گھری تھی۔ ہیمو نے اطراف دلّی پر قبضہ جما لیا تھا۔ ان خطرات کو دیکھتے ہوئے تاجپوشی کی اسی محفل میں بیرم خاں کو اتفاق رائے سے وکیل سلطنت یعنی وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ مغلوں کا اس سے زیادہ وفادار کوئی نہیں تھا۔

اکبر اور بیرم خاں دلّی کی طرف بڑھے۔ تھانیسر ہوتے ہوتے پانی پت کے تاریخی میدان میں پہنچے جہاں اکبر کا دادا بابر تیس سال پہلے ایک جنگ جیت چکا تھا اور باپ چند سال پہلے ایک جنگ ہار چکا تھا۔ یہاں ان کا مقابلہ ہیمو سے ہوا جس کی فوج مغلوں سے کہیں زیادہ تھی۔ بیرم خاں نے ایک جوشیلی تقریر کی۔ اس نے کہا "آج مغلوں کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔" اس کی تقریر نے سپاہیوں کے دلوں کو امنگ اور حوصلہ سے بھر دیا۔ مگر ہیمو کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ مغلوں کے پاؤں اکھڑنے والے تھے۔ فیصلہ ہیمو کے حق میں ہونے والا تھا کہ اسی وقت ایک تیر ہیمو کی آنکھ میں لگا اور وہ زمین پر گر گیا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا ــــ یہ مغلوں کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایک ہاری ہوئی جنگ جیت گئے اور ہیمو کی بدقسمتی کہ وہ جیتی ہوئی جنگ ہار گیا۔ اس کے سپاہیوں نے بہت کوشش کی کہ اسے میدان جنگ سے لے جائیں مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

ہیمو کو اکبر کے سامنے پیش کیا گیا۔ بیرم خاں نے اکبر سے کہا کہ ہیمو کا سر اپنی تلوار سے قلم کر کے غازی کا درجہ حاصل کر لے مگر اکبر نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ ایک زخمی انسان پر اپنی تلوار نہیں اٹھا سکتا۔ اس پر بیرم خاں نے خود ہی ہیمو کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا۔

؏ اس کا اصل نام ہیم راج تھا۔ وہ ذات کا بنیا تھا اس لیے تاریخ میں ہیمو بقال کے نام سے مشہور ہے وہ ریواڑی کے ایک مقام دیولی سچاری کا رہنے والا تھا۔ اس نے بکرماجیت کا خطاب اختیار کر لیا تھا۔ اکبر کے ایک امیر خاں زمان علی قلی خاں محرمی بہارلو کے ہاتھوں اسے شکست ہوئی۔

اس دوران جو ایک اہم واقعہ پیش آیا وہ بیرم خاں کی شادی ہے۔ ہمایوں نے سلیمہ بیگم سے بیرم کا رشتہ طے کیا ہوا تھا۔ سلیمہ، گلرخ بیگم کی بیٹی تھی اور بابر کی نواسی اور اس طرح وہ ہمایوں کی بھتیجی تھی۔ شادی کا محض وعدہ ہی تھا۔ اسی زمانہ میں بیگمات حرم کابل سے ہندوستان آگئی تھیں۔ اکبر لاہور سے دہلی کی جانب کوچ کر رہا تھا۔ جالندھر کے قریب یہ شاہی قافلہ خیمہ زن ہوا۔ بیرم خاں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اکبر سے ہمایوں کے وعدہ کو یاد دلایا۔ اکبر نے منظوری دیدی اور بیرم خاں اور سلیمہ بیگم[1] کی شادی بڑے دھوم دھام سے منائی گئی۔ اس کے بعد بیرم خاں اور اکبر کے درمیان تعلقات کشیدہ ہونے شروع ہو گئے۔ اب اکبر کی عمر ۱۸ سال ہو گئی تھی اور وہ خود حکومت کرنا چاہتا تھا۔

اختلافات کو ہوا دینے میں اکبر کی دایا ماہم انگا[2] نے اہم رول ادا کیا۔ خود بیرم کی

ع۱ زیادہ تر کتابوں کے مطالعے سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ سلیمہ بیگم، عبدالرحیم خانخاناں کی حقیقی ماں تھی جبکہ وہ سوتیلی ماں تھی۔ سلیمہ بیگم سے شادی کے چار سال بعد ہی بیرم خاں کو قتل کر دیا گیا۔ اور سلیمہ جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی۔ وہ ایک اچھی شاعرہ تھی۔ مخفی تخلص کرتی تھی۔ خوبصورت اور عقلمند تھی۔ اسے خدیجۂ عصر کا خطاب دیا گیا تھا۔ مغل عہد میں وہ بہت بعد تک زندہ رہی اور شہزادہ سلیم نے جب باپ کے خلاف بغاوت کی تو اس نے مصالحت کرانے میں اہم رول ادا کیا۔ وہ خود الہ آباد گئی اور شہزادہ کو لاکر باپ کے قدموں میں ڈالدیا۔ بیرم خاں کی موت کے بعد اکبر نے خود سلیمہ بیگم سے شادی کر لی۔

ع۲ ماہم انگا (انگہ) کو مغل تاریخ میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اکبر کی وہ دایا تھی اگرچہ اس نے اسے دودھ نہیں پلایا تھا مگر بادشاہ اسے ماں کا درجہ دیتا تھا۔ وہ امور سلطنت میں دخیل تھی۔ اکبر کی تخت نشینی کے ابتدائی سالوں میں اسی کا حکم چلتا تھا۔ اس نے بیرم کی مدد سے بادشاہ کو پوری طرح اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ اس لیے اکبری عہد کے اس دور کو "پیٹی کوٹ گورنمنٹ" کا نام دیا جاتا ہے۔ اکبر نے جس طرح بیرم خاں سے نجات حاصل کی، اسی طرح بعد میں ماہم انگا سے بھی چھٹکارا پالیا۔ ماہم کا ایک بیٹا مرزا عزیز کوکلتاش تھا جو محمد خاں اعظم کے نام سے بھی مشہور ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ وہ مغل دربار میں ممتاز عہدوں پر کام کر چکا تھا (بقیہ اگلے صفحہ پر)۔

زیا دتیوں کو بھی اس میں دخل تھا۔ اس نے بڑے بڑے ترک عہدہ داروں جیسے ،
تردی بیگ اور محاسب خاں کو پھانسی دیدی۔ وکیل محمد شیروانی جو وکیل تھا اور ایک مقبول
امیر تھا اسے ہٹا کر اس کی جگہ ایک غیر معروف شخص کو مقرر کر دیا۔ شیخ گدائی کمبھو کو جو شیعہ
تھا صدرالصدور مقرر کر دیا اور ایک مشہور سنی صوفی محمد غوث کو ایذائیں پہنچاتا رہا۔ دربار
کے سنی امرا محسوس کرنے لگے کہ بیرم خاں اپنے ہم مسلک لوگوں کو فائدہ پہنچا رہا تھا۔
سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ بیرم خاں نے بادشاہ کے دعویداروں کو نظرانداز کرتے ہوتے
خود اپنے ہی رشتہ داروں کو پنج ہزاری منصب دیدیے۔ اکبر کے حرم کا خرچ کم کر دیا
اور بادشاہ کے صرف ذات کو بالکل ختم کر دیا۔ بیرم خاں پر یہ بھی الزام تھا کہ وہ اکثر
بادشاہ کے بارے میں ہرزہ سرائی کرتا تھا۔ ماہم انگا، اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو
پسند نہیں کرتی تھی، کیونکہ وہ خود اپنے بیٹے محمد اعظم خاں کو وزیراعظم بنانا چاہتی تھی۔ یہ
ایسی صورت حال تھی جس میں یا تو بادشاہ گھٹنے ٹیک دیتا یا بیرم خاں کو جانا پڑتا۔ آخرکار
قسمت نے فیصلہ بیرم خاں کے خلاف کر دیا۔

حرم کی بیگمات حمیدہ بانو بیگم جو بادشاہ کی ماں تھی۔ ماہم انگا اور اس کا بیٹا
اعظم خاں اور اس کا ایک عزیز شہاب الدین احمد خاں نے جو دلی کا گورنر بھی تھا مل کر
بیرم خاں کے خلاف سازش کی۔ بیرم خاں فوج کا سپہ سالار تھا اور حرم پارٹی کو
خوف تھا کہ اگر بیرم خاں کے خلاف کاروائی کی گئی تو شاید فوج میں بغاوت پھیل جاتے۔
منصوبہ کے مطابق بادشاہ بیرم خاں سے اجازت لیکر شکار کے بہانہ آگرہ سے روانہ
ہوا۔ سکندرہ پہنچنے پر ماہم انگا بھی وہاں پہنچ گئی اور بادشاہ سے کہا کہ وہ دلی چلے۔

پچھلے صفحہ کا بقیہ :

اکبر کا منہ چڑھا تھا۔ بڑا بدتمیز اور بدمزاج تھا۔ اکبر کی پالیسیوں پر سخت نکتہ چینی کرتا تھا۔ اس
کے مذہبی خیالات کو بھی ناپسند کرتا تھا۔ بھرے دربار میں گستاخی سے بھی نہیں ہچکچاتا تھا۔ اکبر
اس کی گستاخیوں سے چشم پوشی کرتا تھا اور اکثر یہ کہا کرتا تھا کہ میرے اور کوکلتاش کے بیچ
دودھ کی نہر بہتی ہے، وہ میرا رضاعی بھائی ہے۔ عبدالرحیم خانخاناں کی شادی کوکلتاش
کی بہن ماہ بانو سے ہوئی تھی۔

جہاں اس کی ماں سخت بیمار ہے۔ شہاب الدین احمد خاں نے جو دلّی کا گورنر تھا۔ بادشاہ کا خیر مقدم کیا۔ سازش میں شریک سبھی امرا یہاں موجود تھے۔ بادشاہ نے دلّی سے بیرم خاں کو لکھا۔ "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ حج کے لیے روانہ ہو جائیں جس کی خواہش آپ اکثر کرتے رہے ہیں۔۔۔ اخراجات کا انتظام کر دیا جاتے گا۔" اس کے بعد بیرم خاں اور اکبر کے درمیان مزید کچھ خط وکتابت ہوئی مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ حرم سازش کامیاب ہوگئی۔ بیرم خاں کا بادشاہ سے تعلق منقطع ہو گیا۔ یہ خبر منصوبہ بند طریقہ پر تمام جگہ پھیلا دی گئی۔ امرا جوق در جوق آگرہ سے دلّی میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔

بیرم خاں کے باقیماندہ حواریوں نے مشورہ دیا کہ مزاحمت کی جائے اور بادشاہ کے خلاف لڑا جاتے۔ مگر وفاداری بیرم خاں کے خون میں شامل تھی۔ اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے حج پر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ میوات پہنچا۔ وہاں سے ناگور آیا۔ یہاں اس نے شاہی تمغے، وزارت عظمیٰ کا تمام ساز وسامان مہریں وغیرہ سب بادشاہ کو واپس بھجوا دیں۔ بادشاہ بڑا خوش ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بیرم خاں کے تمام وفاداروں نے راستہ ہی میں جن میں شیخ گدائی بھی تھا اور جس کی وجہ سے خاص طور پر بیرم خاں پر عتاب نازل ہوا تھا اس کا ساتھ چھوڑ دیا اس کے برخلاف ہندو راجاؤں جیسے راتے کلیان مل اور اس کے بیٹے راتے سنگھ نے جو اس علاقہ کے زمیندار تھے بیرم خاں کا شاندار استقبال کیا۔

مگر شاید حرم پارٹی کو یقین نہیں تھا کہ بیرم خاں اتنی آسانی سے ہار مان جاتے گا۔ انھیں اندیشہ تھا کہ وہ حملہ آور ہو گا۔ یا شاید اس لیے کہ اسے مزید سوچنے کا موقع ہی نہ دیا جاتے۔ اس کا پیچھا کرنے کے لیے ایک فوجی دستہ روانہ ہوا۔ پیر محمد خاں شیروانی جس کی قیادت کر رہے تھے۔ یہ وہی پیر محمد خاں تھے جو بیرم خاں کے وفادار افسروں میں تھے۔ اس پر بیرم خاں کو غصہ آیا اور اس نے بھی ہتھیار اٹھا لیے۔ کچھ موقع پرستوں نے بھی ہوا دی ہوگی۔ بیرم خاں پنجاب کی جانب بڑھا۔ اپنی بیوی، بچوں جن میں اس کا وارث عبدالرحیم بھی تھا اور تمام ساز وسامان کو شیر محمد دیوانہ کے سپرد کیا۔ جو اس کا وفادار تھا۔ دیوانہ نے بھی غداری کی بیرم خاں کا ساز وسامان لوٹ لیا۔ بیگمات کی

شان میں بھی گستاخی کی ۔ بیرم خاں کو یہ سن کر بڑا دکھ ہوا ۔ اس نے اس پر حملہ کر دیا ۔ دیوان نے بیرم کے خلاف بادشاہ کو رپورٹ بھیج دی ۔ بادشاہ نے اتکا خاں کی قیادت میں ایک بڑی فوج بیرم خاں کے خلاف بھیجی ۔ بیرم خاں ہار گیا اور اس نے شوالک پہاڑیوں میں پناہ لی ۔ اس کے تمام وفادار افسر بادشاہ کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے ۔ بادشاہ نے اس کا تمام ساز و سامان ضبط کر لیا ۔ اس میں ایک بیش بہا عَلَم بھی تھا جس میں قیمتی ہیرے جواہرات جڑے تھے ، اور جو بیرم خاں امام رضاؑ کے مزار پر چڑھانا چاہتا تھا ۔ یہ عَلَم شاہی خزانہ میں داخل کر دیا گیا ۔ بیرم خاں دریا تے بیاس کے کنارے واقع ایک چھوٹے سے قلعہ میں جا چھپا ۔ اس جنگ میں اس کا ایک وفادار امیر سلطان حسین جلیر بھی مارا گیا ۔ وہ غیر معمولی حسین وجمیل تھا ۔ مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا اور بہادر اور حوصلہ مند تھا جب اس کا کٹا ہوا سر بیرم خاں کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اپنا چہرہ رومال سے ڈھانپ لیا اور یہ کہتے ہوتے زار و قطار رونے لگا " ہائے ! افسوس صد افسوس ، میری اپنی بد قسمتی کی وجہ سے ایسے ایسے کتنے نوجوان اس جنگ میں شہید ہو گئے ۔ " آخر کار بیرم خاں نے اپنے کو بادشاہ کے سپرد کر دیا ۔

بیرم خاں نے معافی نامہ لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیجا ۔ بادشاہ نے اسے معاف کر دیا ۔ منعم خاں اور دوسرے امیروں کو اس کے پاس بھیجا کہ عزت واحترام کے ساتھ اسے لیکر آئیں ۔ حاجی پور میں جہاں بادشاہ خیمہ زن تھا ۔ بیرم خاں کی اپنے آقا سے ملاقات ہوئی ۔ بڑا دلگداز منظر تھا ۔ بیرم خاں قدموں میں گر گیا اور معافی مانگنے لگا ۔ لیکن اکبر نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ تین باتوں میں سے اپنے لیے کسی ایک کو چن لے ۔ چندیری اور کالپی کے اضلاع بطور جاگیر لے لے اور آرام سے زندگی گذارے یا بادشاہ کی مصاحبت قبول کر لے یا پھر حج کے لیے چلا جاتے ۔ اس نے آخر الذکر پیش کش قبول کر لی اور حج کے لیے روانہ ہوا ۔ چند روز اس نے منعم خاں کے ساتھ قیام کیا جو اَب اس کی جگہ وزیر اعظم بن گیا تھا ۔ منعم خاں اس کے ساتھ نہایت عزت سے پیش آیا ۔ تمام ضروری ساز و سامان اور پیسہ فراہم کر دیا گیا ۔ زاد سفر کے لیے پچاس ہزار روپیہ دیا گیا ۔

بیرم خاں سرہند ، ہانسی اور راجپوتانہ ہوتا ہوا ، پٹن پہنچا جسے نہر والا یا انہل واڑہ

بھی کہتے ہیں۔ پٹن گجرات کا قدیم دارالخلافہ تھا اور جس کا صوبیدار ایک افغان موسیٰ خاں فولادی تھا۔ اس نے بھی بیرم خاں کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور اس کی خوب آؤ بھگت کی۔ اس سفر میں اس کی بیوی اور بیٹا عبدالرحیم بھی اس کے ساتھ تھے۔ پٹن میں قیام کے دوران بیرم یہاں کی جھیلوں اور باغوں سے بہت لطف اندوز ہوا۔ ایک دن میں جنوری ۱۵۶۱ء وہ یہاں کی بڑی جزیرہ نما جھیل سہس لنگا تلاؤ[۱] میں سیر کر رہا تھا۔ جب وہ جھیل سے باہر آیا تو تیس چالیس پٹھانوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ خنجر اس کے سینہ میں پیوست کر دیا گیا اور وہ اسی وقت مر گیا۔ ایک پٹھان مبارک خاں لوہانی نے یہ حملہ کیا تھا کیونکہ اس کا باپ مچھی واڑہ کی جنگ میں بیرم خاں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اس کے فعل کا دوسرا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ بیرم خاں افغان سلطان سلیم شاہ کی بیوہ اور بیٹی کو اپنے ہمراہ لیے جا رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے عبدالرحیم کی شادی اس کی لڑکی سے کرنا چاہتا تھا۔ جو بات پٹھانوں کو ناگوار تھی۔ اس کے قتل کے بعد اس کے خیمہ کو لوٹ لیا گیا۔ اس کے بیوی بچے بڑی مشکل سے احمد آباد پہنچے۔ چند فقیروں نے اس کی لاش کو ایک صوفی شیخ حسام الدین کے مقبرہ کے قریب دفنا دیا۔[۲]

بابا زنبور اور دوسرے چند وفادار ملازم بیرم خاں کی بیوہ سلیمہ بیگم اور اس کے بیٹے عبدالرحیم کو جس کی عمر چار پانچ سال تھی، بچانے میں کامیاب ہو گئے اور انہیں بحفاظت احمد آباد پہنچا دیا۔ وہاں سے اکبر نے انہیں اپنے پاس بلایا۔ رحیم کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔

بیرم خاں ایک بڑی دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ مغلوں کے تئیں اس کی فوجی اور سیاسی خدمات کا ہم نے ذکر کیا۔ اسے قسمت کی ستم ظریفی ہی کہا جاتے گا کہ ایک معمار سلطنت کا انجام ایسا عبرتناک ہوا۔ اقتدار کی ہوس، مذہبی تعصب اور کچھ زیادتیاں شاید اس کے زوال کے اسباب تھے۔ تاہم اس کی وفاداری ہر شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ وہ خود تو بادشاہ بننا نہیں چاہتا تھا اس نے جو کچھ بھی کیا مغل سلطنت اور

۱؎ سہس ہندی میں ہزار کو کہتے ہیں۔ لنگا سے مراد لنگا مندر ہے اور تلاؤ تالاب کو کہتے ہیں۔ اس جھیل کے چاروں طرف ایک ہزار لنگا مندر تھے۔

۲؎ سترہ سال بعد (۱۵۷۷) بیرم خاں کی وصیت کے مطابق اس کی لاش کو مشہد لیجا کر دفنا یا گیا۔

اپنے آقا کے مفاد کے لیے کیا۔ انتظام اور نظم ونسخ کے لیے سختی ناگزیر ہوتی ہے۔ بیرم کو بھی سخت اقدامات کرنے پڑے۔ کسی حد تک مذہبی تعصب کا اس پر الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے دوسرے کارناموں کو دیکھتے ہوتے یہ معمولی سی کمزوری جو انسانی فطرت ہے قابل معافی ہے۔

بیرم خاں ایک عالم، ادیب، شاعر اور درویش صفت انسان تھا۔ شاعری میں اس کے دو دیوان اس کے نام سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ ایک فارسی اور دوسرا ترکی۔ وہ مذہبی انسان تھا اکثر اس پر حال کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ حضرت علیؓ کی شان میں اس نے کئی قصیدے تحریر کیے۔ ہمایوں کی تعریف میں بھی قصیدے لکھے۔ فنون لطیفہ سے اسے گہری دلچسپی تھی۔ خاص طور پر شاعری سے شغف رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ ہاشم قندھاری کی ایک غزل اپنے نام سے منسوب کرلی۔ بعد میں شاعر کو ساٹھ ہزار ٹنکے معاوضہ دیا۔ ہاشم کی درخواست پر یہ معاوضہ بڑھا کر ایک لاکھ کر دیا۔ وہ موسیقی کا بھی دلدادہ تھا اور اس کا ایک اچھا پارکھ بھی۔ اس نے اپنے زمانہ کے مشہور موسیقار رام داس کو ایک لاکھ ٹنکا انعام میں دیے تھے۔

بذلہ سنجی اور خوش طبعی بھی بیرم کے مزاج کا حصہ تھی۔ ایک دفعہ ہمایوں بیرم سے گفتگو کر رہا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ بیرم باتیں سنتے سنتے اونگھنے لگا۔ بادشاہ نے خفا ہو کر کہا۔ "بیرم خاں! میں تجھ سے مخاطب ہوں اور تو ہے کہ سو رہا ہے۔" بیرم خاں نے برجستہ جواب دیا "حضور! میں ہمہ تن گوش ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ بادشاہوں کی صحبت میں نگاہوں پر قابو رکھنا چاہیئے۔ درویشوں کی صحبت میں دل پر اور عالموں کی محفل میں زبان پر۔ حضور والا، بادشاہ کے ساتھ ساتھ ایک درویش اور عالم بھی ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں کس چیز پر قابو رکھوں"۔ بادشاہ اس جواب پر خوش ہوا۔

اپنے آقا کے تئیں وفاداری اور غیر معمولی ذہانت یہ دو خوبیاں بیرم خاں کو دوسرے امرا سے ممتاز کرتی ہیں۔

ہمایوں کا بھائی باغی شہزادہ تھا۔ حلف وفاداری اٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ ہمایوں کامران کو دو فرمان بھیجتا ہے اور اس کام کے لیے بیرم خاں کو منتخب

کرتا ہے۔ بیرم خاں جانتا تھا کہ کامران بادشاہ کے فرمان کھڑے ہو کر وصول نہیں کرے گا چونکہ ایسا کرنے سے ہمایوں کے تئیں اس کی وفاداری ثابت ہو جاتی ہے۔ بیرم خاں جب فرمان لے کر اس کے حضور پہنچا تو پہلے اس نے قرآن حکیم کا ایک قلمی نسخہ اس کی خدمت میں پیش کیا جسے اس نے کھڑے ہو کر وصول کیا اور اسی وقت بادشاہ کے فرمان بھی اس کو دیدیے۔ امرا موجود ہیں۔ انھوں نے شہزادے کو کھڑے ہو کر فرمان وصول کرتے ہوتے دیکھا۔ کچھ سرکاری رسل و رسائل نے اس واقعہ کو ہوا دی بات مشہور ہو گئی شہزادہ کی سرکشی کا زور ٹوٹ گیا۔

ہاشم قندھاری کی اس غزل کے چند اشعار بھی ملاحظہ کیجئے جو بیرم خاں نے اپنے نام سے منسوب کر لی تھی۔

من کیستم عنان دل از دست دادہ	وز دست دل بہ راہ غم از پا دافتادہ
ہم چشم جاں بہ صورت جاناں کشودہ	ہم خون دل ز دیدۂ گریاں کشادہ
گاہے چو شمع ز آتش دل گرفتۂ	گہہ چو قبیلہ باد دل آتش فتادہ
بیرم ز فکر اندک و بسیار خار غم	ہرگز نگفتہ ایم کمی یا زادہ

بیرم خاں کی ایک غزل اس کی فارسی شاعری کے نمونے کے طور پر نقل کی جاتی ہے:۔

ہمیشہ درد و ملامت کشیدہ ام از تو	بلا و محنت بسیار دیدہ ام از تو
رسیدہ است بسی نامرادیم ز رقیب	اگر دمی بمرادی رسیدہ ام از تو
بہار حسن و جمال دلی چہ سود کہ من	بعمر خود گل وصلی نچیدہ ام از تو
وفا و مہر تو ہرگز نمی رود ز دلم	اگرچہ مہر و وفائی ندیدہ ام از تو
ز بزم عیش و فراغت رمیدہ چوں بیرم	بکنج محنت و غم آرمیدہ ام از تو

۳

ابتدائی زندگی

1 گھریلو حالات

جب مغل فوج ہیمو کے خلاف برسرپیکار تھی تو بیرم خاں کے بیوی بچوں کو لاہور منتقل کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ ہیمو کی طاقت کو ختم کر دیا گیا تھا لیکن اکبر کا ایک اور حریف سکندر سور پنجاب میں مشکلات پیدا کر رہا تھا۔ اکبر نے ایک ماہ دلّی میں قیام کیا ہوگا کہ سکندر سور کے خلاف مہم پر نکلا اور سرہند پہنچا۔ مغل فوجیں سرہند سے لاہور کی طرف کوچ کر رہی تھیں۔ بادشاہ اور بیرم خاں جن کی قیادت کر رہے تھے راستہ میں خبر پہنچی کہ لاہور میں جمال خاں میواتی کی چھوٹی بیٹی اور بیرم خاں کی بیوی نے جمعرات کے دن مورخہ ۱۴۔ صفر ۹۶۴ھ یعنی ۱۷ دسمبر ۱۵۵۶ء کو ایک بیٹے کو جنم دیا ہے جس کا نام عبدالرحیم رکھا گیا۔ بیٹے کی پیدائش ایک نیک شگون مانا گیا کیونکہ بادشاہ کو پنجاب میں مکمل فتح حاصل ہوگئی تھی۔ بادشاہ نے جشن کا حکم دیا۔ بیرم خاں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا کہ بڑھاپے میں میں بیٹا پیدا ہوا تھا۔ جس جس کو خبر ملی وہ مبارکباد دی کے لیے دوڑا۔ شاعروں نے قصیدے لکھے۔ بھانڈوں نے ناٹک کھیلے۔

پٹن کے مقام پر جب بیرم خاں کو قتل کر دیا گیا تو رحیم کی عمر چار پانچ سال تھی ماں اور بیٹے کو بمشکل احمد آباد پہنچایا گیا۔ اکبر نے حکم دیا کہ بچّہ اور اس کی ماں سلیمہ بیگم کو بحفاظت دربار میں لایا جائے۔ وفادار نوکر انھیں لینے کے لیے بھیجے گئے ــــ جو ۱۵۶۱ء کی ابتدا میں آگرہ پہنچے۔ بادشاہ نے رحیم کو اپنی گود میں بٹھایا۔ اس کے عیش و آرام کے احکامات صادر کیے۔ یہ تاکید کر دی گئی کہ بچہ کے سامنے مرحوم باپ کا کوئی ذکر نہ کرے۔ بابا زنبور کو اس کی خدمت کے لیے مقرر کیا گیا۔ بچہ اکثر سوتے

سوتے گھبرا کر اُٹھ جاتا اور پوچھتا "میرے باباکہاں ہیں ؟" بادشاہ کہتا" بیٹا وہ حج کے لیے گئے ہیں ۔ خدا کے گھر گئے ہیں ۔ جلد آ جائیں گے ۔" اور پھر بابا زنبور کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا " دیکھو! رحیم میرا بیٹا ہے ۔ اس کو میری نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا ۔" بادشاہ نے مخلص لوگوں کو ہی اس کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کیا اور بادشاہ کی دلچسپی کو دیکھتے ہوتے وہ کوئی کوتاہی نہ کرتے تھے ۔ لیکن دربار میں بیرم خاں کے بہت دشمن موجود تھے جو بادشاہ کے کان بھرتے رہتے تھے ۔ وہ دوران گفتگو گھما پھرا کر بیرم خاں کی زیادتیوں کا ذکر کرتے اور مقصد رحیم کے تئیں بادشاہ کی محبت کو کم کرنا تھا ۔ مگر بادشاہ پر ان کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا ۔ تمام مخالفتوں کے باوجود اکبر نے رحیم کو اپنے وقت کی بہترین تعلیم دلائی ۔ نہ صرف اسلامی علوم پڑھانے کا انتظام کیا بلکہ فوجی تربیت بھی دلائی ۔ اس زمانہ کے ایک عالم ملاّ محمد اند جانی کو رحیم کا استاد مقرر کیا ۔ اس کے علاوہ بھی ہر شعبۂ علم کے لیے الگ الگ استادوں کو مقرر کیا ۔ عبدالرحیم غیر معمولی ذہانت اور قوی حافظہ کا مالک تھا ۔ اس لیے وہ چیز دل کو جلد سیکھ لیتا ۔ اس زمانہ کے مروجہ علوم میں قرآن وحدیث، منطق وفلسفہ، ادب، قواعد، خطاّطی وغیرہ تھے جو رحیم نے بھی حاصل کیے ہوں گے ۔ عربی فارسی ترکی زبانیں سیکھیں ۔ رحیم کو زبانیں سیکھنے میں خاص ملکہ حاصل تھا ۔ وہ اور بھی کئی زبانیں جانتا تھا ۔ سنسکرت اور ہندی خاص طور پر سیکھی تھی ۔ علم وادب کے تئیں اس کی خصوصی دلچسپی تھی اور وہ درویشی مزاج رکھتا تھا ۔ رحیم کے بچپن کے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے مورخین کسی شخص کی طرف اسی وقت توجہ دیتے تھے جب اسے کوئی عہدہ ملتا تھا ۔ اس لیے رحیم کی زندگی کے تفصیلی حالات اسی وقت سے دستیاب ہوتے ہیں جب سے اس نے جنگی مہمات پر جانا شروع کیا ۔

جب رحیم سن بلوغت کو پہنچا تو بادشاہ نے اسے مرزا خاں کا خطاب دیا ۔ اور اس کی شادی ماہ بانو سے کردی جو مرزا عزیز کوکلتاش (خان اعظم) کی بہن، شمس الدین محمد خاں (اتکا خاں) اور ماہم انگا کی بیٹی تھی ۔ یہ سب اکبر کے رضاعی رشتے دار تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے یہ شادی اس لیے کی تھی تاکہ

اسس کے باپ کے دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے رحیم کو نجات حاصل ہو اور اسے کوئی تنگ نہ کرے۔ دوسرے لفظوں میں دربار میں رحیم کی پوزیشن مضبوط بن جاتے ہے[1]

II اولاد

رحیم اپنی بیوی ماہ بانو سے بہت محبت کرتا تھا اور وہ بھی ایک وفا شعار بیوی تھی۔ اس سے رحیم کے تین بیٹے پیدا ہوئے۔ ماہ بانو کا انتقال ۱۵۹۷ء میں انبالہ کے مقام پر ہوا۔ رحیم نے ایک اور خاتون سے شادی کی جس کا تعلق سوہیا یا سدھا ذات سے تھا ــ شاید یہ ہندو خاتون ہوگی۔ ایک باندی بھی رحیم کے حرم میں داخل تھی جس کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا بیٹیوں کے بارے میں زیادہ تفصیلات معلوم نہیں تاہم رحیم کی دو بیٹیوں کے نام معلوم ہیں۔ ایک کا نام جانا بیگم اور دوسری کا خیرالنسا تھا۔ جانا بیگم کی شادی شہزادہ دانیال سے ہوئی تھی جو کثرت شراب نوشی کی وجہ سے عین جوانی میں مرگیا اور جانا بیگم بیوہ ہوگئی۔ جانا بیگم کافی بعد تک زندہ رہی اور باپ کی خدمت کرتی رہی۔ وہ نیک سیرت اور مذہبی خاتون تھی۔ بیوہ ہوجانے کے بعد ہمیشہ سفید کپڑے پہنتی تھی۔ یہاں تک کہ جسم پونچھنے کے لیے رنگین کپڑا تک استعمال نہیں کرتی تھی۔ نہایت ذہین اور سلیقہ مند تھی۔ خیرالنسا کے بارے میں تزک جہانگیری میں ایک واقعہ نقل کیا ہے۔

---

[1] یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اکبر کو عبدالرحیم کے معاملات میں اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہوگئی تھی اس کی ایک وجہ تو یہی سمجھ میں آتی ہے کہ اکبر نے اس کے باپ کے اقتدار کو ختم کر دیا تھا مگر مغل سلطنت کے استحکام کے لیے بیرم خاں نے جو قربانیاں دی تھیں وہ ان کا دل سے معترف تھا۔ دوسری سب سے بڑی وجہ بیرم خاں کی بیوہ سلیمہ بیگم تھی جس سے اکبر نے شادی کرلی تھی۔ سلیمہ بیگم غیر معمولی حسن و جمال اور صلاحیتوں کی مالک تھی اور اکبر کی شخصیت پر اس کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ رحیم اس کا بیٹا تھا سوتیلا ہی سہی مگر وہ اس سے محبت کرتی تھی اور اس کی سیرت کی تعمیر میں اس کا بھی حصہ تھا۔

ایک مرتبہ جب وہ باپ کے ہمراہ احمد آباد میں تھی تو رحیم نے جہانگیر کی دعوت کی۔ موسم خزاں تھا۔ باغ ویران تھا۔ تمام پھول و پتے خشک ہو گئے تھے۔ خیرالنسا نے مصوروں کی مدد سے ان پیڑوں پر نقلی پھول اور پتیاں بنوائیں اور پھل بھی لگوا دیے۔ یہ منظر بالکل اصل میں بدل گیا۔ بادشاہ نے موسم خزاں میں ایسا ہرا بھرا باغ دیکھا تو بڑا خوش ہوا۔ پھل کو ہاتھ لگایا تو مصنوعی معلوم ہوا۔ یہ دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی کہ پورا باغ نقلی ہے۔

خیرالنسا کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کی شادی کس سے ہوئی تھی۔ ایک اور بیٹی کا ذکر ملتا ہے جس کی شادی امیرالدین نام کے شخص سے ہوئی تھی اور جو میر جمال الدین انجو کا بیٹا تھا اور جس نے ایک فارسی لُغت فرہنگ جہانگیری تصنیف کی تھی۔

تیس سال کی عمر تک رحیم بیٹوں کی خوشی سے محروم رہا۔ ایک دن بادشاہ نے باتوں باتوں میں کہا رحیم تین بیٹوں کا باپ بنے گا اور ان کے نام ایرج، داراب اور قرن ہوں گے۔ عجب اتفاق تھا کہ یکے بعد دیگرے رحیم کے یہاں تین بیٹے پیدا ہوتے اور نام بھی وہی رکھے گئے۔

مرزا ایرج سب سے بڑا لڑکا تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی اکبر کے زیر سایہ گزری۔ دکن میں اس نے اپنے باپ کے ہمراہ معرکوں میں حصّہ لیا۔ باپ نے اپنے تمام بیٹوں کو اچھی تعلیم دلائی۔ ایرج نے بھی مروجہ علوم حاصل کیے۔ وہ بہترین خطاط تھا۔ نسخ اور نستعلیق کا ماہر تھا۔ اس عہد کے مشہور ہندی شاعر کیشو داس نے ایرج کی تربیت کے لیے جہانگیر جیند ریکا کتاب لکھی۔ جہانگیر نے اسے شاہنواز کا خطاب دیا تھا۔ اکبر نے اپنے فرمانوں میں اور ابوالفضل نے رحیم کے نام خطوں میں اکثر ایرج کا ذکر کیا ہے۔ اسے تین ہزاری ذات اور پانچ ہزاری سوار کا منصب عطا ہوا تھا۔ وہ شکل و صورت میں اپنے باپ سے مشابہ تھا۔ باپ کی صفات بھی ورثہ میں ملی تھیں۔ اسی لیے بادشاہ اور امرا اسے "خانخاناں خورد" کہتے تھے۔

دکن میں ایرج نے کئی معرکے انجام دیے تھے۔ اس نے تلنگانہ کی جنگ میں

ملک عنبر کو پسپا کیا۔ وہ جنگجو اور بہادر سپاہی تھا اسی کے ساتھ اہل فن کی بھی قدر کرتا تھا جو اکثر اس کی صحبت میں رہتے تھے اور وہ ان سے علم و دانش کی باتیں سنا کرتا تھا۔ بلا کا شراب نوش تھا۔ جہانگیر تزک میں اس کی شراب نوشی کا ذکر کرتا ہے اور خانخاناں کو تاکید کرتا ہے کہ اسے شراب نوشی سے منع کرے۔ برہان پور میں جب رحیم بیٹے ایرج کو دیکھتا ہے تو اسے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ کثرت شراب نوشی نے اسے بہت کمزور کر دیا تھا۔ باپ نے بہت علاج کیا۔ مگر وہ شراب نوشی سے ۳۳ سال کی عمر میں جبکہ جوانی کا عالم تھا مر گیا۔

مرزا ایرج کے دو بیٹے منوچر اور طغرل تھے جنھوں نے باپ کے ہمراہ جنگوں میں حصہ لیا۔ اکثر ان کا بھی ذکر آتا ہے۔ ایرج کی ایک بیٹی تھی جس کی شادی شاہجہاں سے ہوئی تھی۔

رحیم کا دوسرا بیٹا داراب خاں تھا۔ وہ بھی بڑا لائق اور بہادر نوجوان تھا اس نے دکن میں ملک عنبر کے خلاف کئی کامیاب مہمیں چلائیں اور سرخرو ہوا۔ کس طرح وہ عبرتناک انجام کو پہنچا اس کا ذکر ہم اگلے صفحات میں کریں گے۔

تیسرا بیٹا رحمٰن داد تھا۔ بادشاہ نے اس کا نام قارن رکھا تھا۔ اس کی پیدائش پر بڑا جشن منایا گیا اور بادشاہ خود رحیم کو مبارکباد دینے آیا۔ نو برس کے بعد پیدا ہوا تھا اس لیے باپ کا چہیتا تھا۔ تزک جہانگیری میں اس کی پیدائش اور موت دونوں کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کا بڑا بھائی داراب خاں دکن میں جنگ میں مصروف تھا تو وہ بھی بھائی کی مدد کے لیے دوڑ پڑا۔ بخار میں مبتلا ہوا۔ جنگ سے لوٹا تو اپنا جبہ اُتار دیا۔ ٹھنڈی ہوا لگی بخار مزید تیز ہو گیا اور اسی حالت میں چل بسا۔ باپ کو بیٹے کی موت سے بڑا صدمہ پہنچا۔ وہ ہر دم اس کی موت کے غم میں ڈوبا رہتا تھا۔ رحمٰن داد کی ماں سوہیا خاندان سے تعلق رکھتی تھی جو امرکوٹ میں قیام پذیر تھا۔ خانخاناں فخر سے کہا کرتا تھا کہ اکبر بادشاہ میری ننہال میں پیدا ہوا تھا۔ اس وجہ سے بھی خانخاناں رحمٰن داد کو عزیز رکھتا تھا۔

رحیم کا ایک اور بیٹا مرزا امراللہ تھا جو لونڈی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ اس کی صحیح تربیت نہ ہو سکی۔ وہ بھی جوانی ہی میں چل بسا۔ دکن کی مہمات کے دوران

گونڈوانہ کے مقام پر اس نے ایک ہیرے کی کان پر قبضہ کیا تھا جس کے ہیرے اپنی چمک اور خوبصورتی کے لیے مشہور تھے۔

ایک اور بیٹا حیدر قلی تھا جسے رحیم پیار سے حیدری کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ اس کا انتقال بھی جوانی میں ہوا۔ وہ نشہ کی حالت میں آگ میں جلکر مر گیا۔ اس کا ذکر بھی آگے آئے گا۔

میاں فہیم خانخاناں کا بیٹا تو نہ تھا مگر اسے بیٹوں کی طرح پالا تھا۔ اس کے بارے میں کہاوت مشہور تھی۔ کماتیں رحیم لٹاتیں فہیم۔ وہ غلام مشہور تھا۔ اس کا تعلق ایک راجپوت گھرانہ سے تھا۔ صالح ومتقی تھا۔ تہجد۔ چاشت اور اشراق تک کی نمازیں قضا نہیں ہوتی تھی۔ وہ درویشوں اور فقیروں کے ساتھ عزت و محبت سے پیش آتا تھا۔ مگر سپاہیوں کے ساتھ سخت گیر تھا اور کوڑے سے ان کی خبر لیتا تھا۔ فہیم نے کئی جنگوں میں حصہ لیا۔ وہ صاحب الرائے بھی تھا۔ بہت اچھے مشورہ دیتا تھا۔ رحیم کو مہابت خاں کی مکّاری سے اسی نے آگاہ کیا تھا۔ اس نے اپنے آقا کی حفاظت کرتے کرتے جان دیدی۔

III سیاسی زندگی کا آغاز

عبدالرحیم خانخاناں کی سیاسی زندگی کا آغاز دس سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ ۱۵۶۶ء میں اکبر کے رشتے کے بھائی محمد کلیم مرزا نے جو کابل کا حکمراں تھا پنجاب پر حملہ کر دیا۔ بادشاہ نے اس کی سرکوبی کے لیے پنجاب کی طرف کوچ کیا۔ اس وقت بادشاہ نے رحیم کو خلعت عطا کی اور چند وفادار اور تجربہ کار امرا کے ساتھ اسے آگرہ میں سلطنت کے انتظام وانصرام کے لیے مقرر کیا۔

اسی دوران اکبر کو گجرات کی مہم پر روانہ ہونا پڑا۔
گجرات میں احمد شاہ ثانی کے قتل (۱۵۶۱ء) کے بعد مطلق العنانی پھیلی ہوئی تھی۔
نتّو نام کا ایک نوجوان سلطان مظفر سوم کے نام سے گجرات کا حکمراں بن گیا۔
اس کے نام پر دوسرے اُمرا من مانی کر رہے تھے۔ اعتماد خاں جو اس کا وزیر تھا اس صورت حال سے پریشان تھا۔ اس نے حالات کی درستی کے

لیے اکبر کو لکھا۔ بادشاہ نے مظفر شاہ سوم کی بغاوت کو ختم کر دیا۔ اور باغی فوجیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ احمد آباد شہر کی چابی اکبر کے حوالہ کر دی۔ مظفر فرار ہو گیا۔ مرزا عزیز کو کا خان اعظم کو گجرات کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ اکبر آگرہ واپس لوٹ آیا۔ اس مہم میں بادشاہ رحیم کو بھی اپنے ساتھ لے گیا جہاں پٹن کے مقام پر پڑاؤ ڈالا اور رحیم نے اپنے والد بیرم خاں کے مزار کی زیارت کی۔ اکبر کا مقصد بھی یہی تھا۔ بادشاہ نے رحیم کو بیرم خاں کی شہادت کے واقعات سُنائے اور اس واقعہ کی یاد میں پٹن کا ضلع اسے جاگیر میں عطا کیا۔ رحیم ابھی کم عمر تھا۔ اس لیے سعید احمد بارہ کو اس کا معاون اور جاگیر کا منتظم مقرر کیا تاکہ رحیم کو سادات بارہ کا بھی تعاون اور تحفظ حاصل ہو جاتے۔ لیکن چند ماہ کے اندر گجرات میں پھر سے بغاوت پھوٹ پڑی۔ اس مرتبہ محمد حسین مرزا، اختیار الملک گجراتی (حبشی) نے رائے داس اور شیر خاں فولادی کے ساتھ مل کر بغاوت کر دی اور احمد آباد پر حملہ کر دیا۔ شہر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ عزیز کو کا نے مدد کے لیے بادشاہ کو لکھا۔ بادشاہ نے پھر سے بذات خود گجرات جانے کا فیصلہ کیا۔ بلا تاخیر وہ اونٹنیوں پر سوار ہو کر آگرہ سے ۲۳ اگست ۱۵۷۳ء کو احمد آباد کے لیے روانہ ہوا۔ عبدالرحیم خانخاناں اس کے ہم رکاب تھا جس کی عمر اس وقت صرف سولہ سال تھی۔ اکبر نے آگرہ سے احمد آباد تک کا یہ سفر صرف نو ۹ دن میں پورا کر لیا جو تاریخ کا ایک بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اونٹنیوں پر اتنے لمبے فاصلے کو اتنی جلدی طے کرنے کی دوسری مثال نہیں ملتی ہے۔ یہ جنگ اس اعتبار سے بھی اہم تھی کہ اکبر نے صرف تین ہزار فوجوں کے ساتھ باغیوں کی بیس ہزار فوجوں کو شکست دی۔ اس جنگ میں باغیوں کے دو ہزار افراد کام آتے۔ بادشاہ نے اس پوری مہم کو تین ہفتوں میں مکمل کر لیا۔ عزیز کو کا کو پھر سے گجرات کا گورنر مقرر کرنے کے بعد وہ دارالخلافہ واپس لوٹ آیا۔

عبدالرحیم خانخاناں نے بھی اس جنگ میں نمایاں رول ادا کیا۔ اسے مرکزی دستہ کی کمان سپرد کی گئی تھی جو عام طور پر بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ابوالفضل نے آئین میں ۳۷ افسروں کے نام دیے ہیں جو بادشاہ کے ساتھ تھے۔ ان میں رحیم کا نام پہلے نمبر پر لکھا ہے۔

بادشاہ نے عزیز کو کا کو گجرات سے واپس بلا لیا۔ گھوڑوں کو داغنے اور ان کا حساب

کتاب رکھنے کا نیا شعبہ قائم کیا تاکہ منصب دار فرضی حساب نہ رکھ سکیں۔ مرزا عزیز کوکا کو اس شعبہ کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اس نے اس کام کو انجام دینے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے اسے معزول کر دیا اور اس کے بعد عزیز کوکا اپنے گھر میں نظر بند رہا اور ایک درویش کی زندگی گزارتا رہا۔ اس کی جگہ عبدالرحیم خانخاناں کو گجرات کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ اس کی مدد کے لیے آزمودہ کار امرا کو مقرر کیا۔ وزیر خاں ہروائی کو نائب صوبیدار بنایا۔ میر علاؤ الدولہ کو امین، سید مظفر بخشی اور بہین داس کو دیوان مقرر کیا۔ رحیم نے اعلیٰ کارکردگی کا ثبوت دیا اور اس کے حُسنِ نظام سے بادشاہ بہت خوش ہوا۔

رحیم کی عزت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور وہ تیزی سے ترقی کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اس میں بادشاہ کی خصوصی توجہ کا بھی دخل تھا۔ ۱۵۸۲ء میں خانخاناں کو شہزادہ سلیم (جہانگیر) کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ یہ اعزاز بھی اہمیت کا حامل تھا۔ ہر طرح سے موزوں شخص کو ہی یہ خدمت سپرد کی جاتی تھی۔ جو عالم فاضل بھی ہو۔ جنگی اور سیاسی سوجھ بوجھ بھی رکھتا ہو۔ جو اہل قلم بھی ہو اور اہل سیف بھی۔ جب رحیم کو شہزادہ کا اتالیق مقرر کیا گیا تو رحیم کی عمر ۲۶ سال تھی اور شہزادہ تیرہ سال کا۔ اس موقع پر رحیم نے ایک شاندار جشن کا اہتمام کیا۔ بادشاہ کو گھر پر آنے کی دعوت دی۔ قلعہ سے گھر تک سونے اور چاندی کے پھولوں کی بارش کی گئی۔ پورے راستہ میں مخمل اور زربفت کا قالین بچھایا گیا۔ گھر میں بیٹھنے کے لیے ایک چبوترہ تعمیر کیا گیا جس پر سوا لاکھ روپیہ خرچ آیا۔ آج کے زمانہ کے کروڑ سے زائد روپے ہوں گے۔ بادشاہ کو اس چبوترہ پر بٹھا کر قیمتی نذرانے پیش کیے گئے اور جب بادشاہ اس چبوترے سے اٹھ کر اندر زنانہ خانہ میں گیا تو چبوترہ کو لٹوا دیا گیا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس چبوترے کی کئی قیمتی اشیا امرا تک اٹھا کر لے گئے۔ بادشاہ نے رحیم کو جھنڈا اور دوسرے شاہی نشانات اور اعزازات عطا کیے جو اس سے پہلے شاہی گھرانہ کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں دیے گئے تھے۔ خانخاناں اپنی پگڑی میں کلغی اور پَر کا استعمال کر سکتا تھا جو صرف شاہی خاندان کے افراد کا اعزاز تھا

رحیم نے بحیثیت اتالیق شہزادہ سلیم کو مختلف علوم کی تعلیم دی۔

فارسی، ترکی اور ہندی زبانیں سکھائیں۔ ان زبانوں کے ادب سے روشناس کرایا۔ فن خطابت اور گفتگو کرنا سکھایا۔ سیاست کے گر بتاتے۔ بعد میں شہزادہ نے اپنے دورِ حکومت میں اس تربیت سے پورا فائدہ اٹھایا۔

اجمیر میں فتنہ و فساد کی روک تھام کے لیے رحیم کو مقرر کیا گیا۔ رنتھمبور کی جاگیر کا انتظام بھی اس کے سپرد ہوا۔ اس زمانہ میں یعنی ۱۵۸۰ء میں رحیم کو میر عرض کا عہدہ بھی سپرد ہوا۔ اس عہدہ پر بادشاہ کا خاص معتمد ہی مقرر کیا جاتا تھا اور وہ عموماً شاہی گھرانہ کا فرد ہوتا تھا۔ میر عرض کا کام امرا اور حکّام کی عرضیاں اور شکایتیں بادشاہ تک پہنچانا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان عرضداشتوں پر میر عرض کو اپنی رائے بھی لکھنی ہوتی ہوگی جس کے لیے سیاسی بصیرت اور تدبّر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد رحیم کی جنگی مہمات کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ جہاں سے اسے پھر پیچھے کی طرف پلٹ کر دیکھنے کی مہلت نہیں ملتی۔ گجرات، سندھ اور دکن میں فوج کی آزادانہ کمان اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اب اسے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے بھرپور مواقع حاصل ہیں۔

(۴)

گجرات کی مہم

عبدالرحیم خانخاناں کے سلسلہ میں گجرات کا ذکر بار بار کیا جاتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ رحیم کی سیاسی زندگی میں گجرات کی بڑی اہمیت ہے۔ گجرات سے نہ صرف یہ کہ اس کی عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے بلکہ اس کے کارنامے منظر عام پر آتے ہیں۔

گجرات کو اس زمانہ میں کئی اعتبار سے کلیدی حیثیت حاصل تھی گجرات قدرتی وسائل سے مالا مال اور تجارت کا بڑا مرکز بھی تھا بین الاقوامی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے تجارتی قافلے یہاں سے گزرتے تھے۔ گجرات مسلم حکمرانوں کی چھاؤنی بھی تھا۔ ساحل سمندر پر ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی۔ یورپی قومیں اس کی بندرگاہ پر آنا شروع ہو گئی تھیں۔ سورت میں پرتگالیوں نے تجارتی کوٹھیاں قائم کر لی تھیں۔ حاجی اکثر براستہ گجرات حج کے لیے جاتے تھے جہاں ان کا واسطہ پرتگالیوں اور دوسرے یورپی لوگوں سے پڑتا تھا۔ کبھی کبھی یہ لوگ حاجیوں کو پریشان بھی کرتے تھے۔ انہیں لوٹ لیتے یا زبردستی پیسہ وصول کرتے۔ اکبر نے پرتگالیوں کے ساتھ ایک معاہدہ بھی کیا تھا جس کے تحت ان سے کچھ سمندری مراعات حاصل کر لی تھیں اور اس طرح سمندر پر پرتگالیوں کی بالادستی کو قبول کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر جب گجرات گیا تو اس نے وہاں پرتگالیوں کے جہاز میں بیٹھ کر کیمبے کے ساحل سے سمندر کی سیر کی جو احمد آباد سے تیس کوس کے فاصلے پر ہے۔ بادشاہ کی آمد کی خبر سن کر وہاں موجود مختلف ملکوں جیسے روم، ایران، شام وغیرہ کے تاجر اپنے اپنے تجارتی سامان کے ساتھ بادشاہ کے سامنے حاضر ہوتے جس سے پتہ چلتا ہے کہ گجرات میں بہت سے غیر ممالک کے

تاجر بھی آباد تھے۔

چودھویں صدی کے اواخر میں جب دلی سلطنت کا شیرازہ منتشر ہوا اور ملک کے مختلف حصوں میں آزاد اور خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں، گجرات بھی ایک خود مختار صوبہ بن گیا۔ محمد بن تغلق کے زمانہ میں مظفر شاہ گجرات کا صوبیدار تھا۔ اس نے بغاوت کر کے گجرات کو دلی سلطنت سے آزاد کر لیا اور خود مظفر شاہ کے نام سے خود مختار سلطان بن گیا۔ جو گجرات کا پہلا سلطان تھا۔

گجرات کا سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور طاقتور سلطان بہادر شاہ ہوا ہے۔ جس کے خلاف ہمایوں کو کئی جنگیں لڑنی پڑیں۔ بہادر شاہ نہ صرف یہ کہ گجراتی عوام میں مقبول تھا بلکہ پورے ہندوستان میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں ہندوستان کا بادشاہ بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں اس کے گرد ملک کے ممتاز سپہ سالار اور جنگجو جمع ہوگئے تھے۔ جب ہمایوں نے افغانوں کی حکومت کو ختم کر دیا تو بہت سے افغان امرا بہادر شاہ کی پناہ میں آگئے۔ یہاں تک کہ مغلوں کے بھی بہت سے امرا بہادر شاہ کا دم بھرتے تھے اور اس کی فوج میں شامل تھے۔ قطب خاں، فتح خاں، عالم خاں وغیرہ جیسے سردار جو بہت بااثر بھی تھے بہادر شاہ کے ساتھ شامل تھے۔ ہمایوں نے مسلسل جنگ کر کے بہادر شاہ کی طاقت کو ختم کر دیا۔ ایک سردار ہندو بیگ نے ہمایوں کو مشورہ دیا تھا کہ گجرات کو مغل سلطنت میں شامل نہ کیا جائے اور گجرات بہادر کو واپس کر دیا جائے۔ اگر ہمایوں ہندو بیگ کا یہ مشورہ مان لیتا تو مغل گجرات میں آئے دن کی بغاوتوں سے بچ جاتے۔ خون خرابہ بھی نہ ہوتا مگر اس زمانہ کی سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر شاید یہ ممکن نہ تھا۔ ریونیو حاصل کرنے کا بھی سوال تھا۔ گجرات ہندوستان کی امیر ترین ریاست کی حیثیت رکھتا تھا فوجوں کو مصروف رکھنا اور میدان جنگ فراہم کرنا اس زمانہ کی ضرورت تھی اور پھر جہاں بانی اور جہاں رانی مغلوں کا شوق بھی تھا جو کسی بھی بادشاہ کا ہوتا ہے۔

ہندو بیگ کا مشورہ قبول نہیں کیا گیا اور گجرات کو مغل سلطنت کا حصہ بنا کر اسے مغل سرداروں میں بانٹ دیا گیا۔ عسکری مرزا، گجرات کا صوبیدار مقرر ہوا

جس کا دار الخلافہ احمد آباد قرار پایا اور ہندو بیگ کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج متعین کی گئی۔ پٹن کا علاقہ یادگار ناصر مرزا کو دیدیا گیا۔ بھروچ اور سورت قاسم حسین سلطان کے حصہ میں آتے۔ کیمبے و بڑودہ میں دوست بیگ کو مقرر کیا گیا۔ محمود آباد اور چمپانیر علی الترتیب میر بچکا اور تردی بیگ کو تفویض ہوتے۔

ہمایوں کی اس پالیسی نے گجرات کو فتنہ سامانیوں اور بغاوتوں کا مرکز بنا دیا۔ ہندو بیگ کا مشورہ ایک اہم اصول پر مبنی تھا کہ مقامی لوگوں کو اپنے حالات خود حل کرنے کا حق ملنا چاہیئے۔ اس سے علاقائیت سر نہیں اٹھاتی۔ گجرات میں ہمایوں کی پالیسی کی وجہ سے مقامی عناصر کو سر اٹھانے کا موقع ملا۔ مظفر شاہی طاقتیں پھر ابھرنے لگیں۔

گجرات میں اکبر بھی اپنے باپ کی پالیسی پر عمل پیرا رہا۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ اکبر خود گجرات گیا اور وہاں بغاوتوں کو ختم کیا۔ دوبارہ وہ گجرات آیا اور دونوں بار عبدالرحیم خانخاناں اس کے ہمراہ تھا۔ اور ان مہموں کے دوران رحیم گجرات سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ مگر رحیم کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ وہ ابھی بچہ تھا اور محض تربیت کے لیے وہ بادشاہ کے ساتھ تھا۔ ان معرکوں میں اس کی شرکت محض تربیتی نوعیت کی حامل تھی۔

اکبر نے مظفر شاہ گجراتی کا زور ختم کر کے شہاب الدین کو گجرات کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ مظفر اپنی سسرال ملُبا کاٹھی قبیلہ کے سردار کے یہاں راجکوٹ کے قریب ایک گاؤں کھردی میں گمنامی کی زندگی گزار رہا تھا اور مناسب موقع اور اپنی کھوئی طاقت کو حاصل کرنے کے لیے مناسب موقع کی انتظار میں تھا۔ مظفر گجراتی گجرات کے اصل وارث سلطان محمود گجراتی کا بیٹا تھا۔ مظفر نے ایک کاٹھی لڑکی سے شادی کی تھی۔ اسی لیے اسے مقامی کاٹھی لوگوں اور ایک اور قبیلے کولی کی حمایت حاصل تھی۔ وہ خود ایک بہادر سپہ سالار تھا۔ اتفاق سے اسے ناراض مغل امرا اور سپاہیوں کی حمایت بھی حاصل ہو گئی۔

۱۶۸۳ء میں اکبر نے صوبیدار شہاب الدین کو گجرات سے واپس بلالیا اور اس کی جگہ اعتماد خاں کو گورنر مقرر کیا۔ اعتماد خاں گجراتی کلچر کا پروردہ تھا اور مقامی رسم و رواج سے واقف کار سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ خواجہ نظام الدین احمد

کو وابستہ کیا گیا جو مشہور مورخ بھی تھا اور جس کی تاریخ طبقات اکبری آج بھی ایک مستند تاریخ مانی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں اس کی عمر بہت کم تھی۔ شاید سب سے کم عمر تھا۔ مگر نہایت بہادر اور جانباز تھا۔ رحیم کا وفادار تھا۔ خواجہ کی ایک بہن ہمایوں سے بیاہی تھی اس لیے وہ رحیم سے خاندانی رشتہ میں منسلک تھا۔ بعد میں اس نے رحیم کے ساتھ کئی جنگوں میں بڑی جانثاری کا ثبوت دیا۔ خواجہ کو اعتماد خاں کا بخشی مقرر کیا گیا۔ میر امین تراب صوبہ کا امین تھا جس پر بادشاہ کو پورا بھروسہ تھا۔ وہ بھی گجراتی تھا مگر سب سے پہلا امیر تھا جس نے بادشاہ کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ ایک اور امیر خواجہ ابوالقاسم کو دیوان کی حیثیت سے گجرات بھیجا گیا۔ چوتھا امیر جو بادشاہ نے گجرات بھیجا میر معصوم بھکری تھا۔ وہ بھی ایک مورخ تھا اور جس نے تاریخ سندھ لکھی۔ ان امرا اور سپہ سالاروں کے علاوہ بادشاہ نے آٹھ ہزار سپاہیوں کی جمعیت جو زیادہ تر بدخشی اور تورانی تھے مقرر کیے تھے۔ انہوں نے شہاب الدین سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ جب اعتماد خاں کو گورنر مقرر کیا گیا تو ان سپاہیوں نے اپنی کچھ مانگیں پیش کیں جو تسلیم نہیں کی گئیں۔ مغل بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ سپاہیوں کی تنخواہ دس روپے ماہوار سے زیادہ نہ بڑھائی جائیں۔ جو انھیں قبول نہیں تھیں۔ جس کے نتیجہ میں یہ امیر مظفر گجراتی سے جا ملے۔ مظفر کو اپنا سردار مقرر کیا۔ اس طرح مظفر گجراتی پھر میدانِ جنگ میں آگیا۔ مغلوں سے دل برداشتہ سات ہزار سپاہی اس کے ساتھ تھے اور جو احمد آباد کی طرف بڑھے۔ راستہ میں مزید ایک ہزار گجراتی اور مغل ان کے ہمراہ ہوگئے۔ تین ہزار کاٹھی فوج اس کے ساتھ تھی۔ اعتماد خاں نے شہاب الدین سے نیا نیا چارج لیا تھا۔ ابھی اس کی پوزیشن مضبوط نہیں تھی۔ وہ مظفر کے گرد اتنی بڑی فوجی طاقت جمع ہونے سے بہت گھبرایا۔

اعتماد خاں نے شہاب الدین سے رابطہ قائم کیا جو ابھی مغل دارالسلطنت کی طرف روانہ ہوا تھا اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ وہ اپنے تبادلہ سے پہلے ہی ناراض تھا اس نے مدد دینے سے منع کردیا۔ اعتماد خاں نے دو دن کی جدوجہد کے بعد آخرکار اسے راضی کرلیا۔ اُدھر مظفر برابر دارالخلافہ کی جانب پیش قدمی

اکر رہا تھا۔ اس کی فوج میں ناراض مغل سپاہیوں کے علاوہ بڑی تعداد میں کاٹھی، کولی اور گجراتی جمع ہو گئے تھے۔ آخر کار مغل فوجوں اور مظفر کے درمیان لڑائی ہوئی جس میں مغل ہار گئے اور مظفر گجراتی کو فتح حاصل ہوئی۔ اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ احمد آباد کی جامع مسجد میں اپنے نام کا خطبہ پڑھا۔ اس جنگ میں خواجہ نظام الدین احمد۔ شہاب الدین اور قطب الدین جیسے آزمودہ کار سپہ سالار بھی ہار گئے۔

شہاب الدین نے اس جنگ اور شکست کی تفصیلی رپورٹ اکبر بادشاہ کو بھیجی جسے پڑھ کر وہ پریشان ہوا۔ جب یہ خبر بادشاہ کو ملی تو وہ الہ آباد میں گنگا جمنا کے سنگم پر قلعہ کی تعمیر میں مصروف تھا۔ اس نے فوراً فوج گجرات بھیجنے کا فیصلہ کیا اور جس امیر کو سربراہی کے لیے چنا وہ نوجوان سپہ سالار عبدالرحیم خانخاناں تھا۔ اس عہد کے مورخین کے مطابق اس مہم کے لیے بہترین انتخاب تھا۔ دوسری بار اسے گجرات کا وائسرائے مقرر کیا جا رہا تھا۔ اکبر نے اس کے نام جو فرمان تحریر کیا اس میں اسے فرزند کہہ کر مخاطب کیا۔ اور وہ تھا بھی فرزند، اس کی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم اکبر کے حرم میں تھی۔ اس کے علاوہ فرمان میں اور بھی توصیفی کلمات رحیم کے لیے لکھے۔ رحیم کی عمر اس وقت ۲۷ برس تھی۔

اکبر نے بہت سے آزمودہ کار اور تجربہ کار مغل اور راجپوت افسر رحیم کے ساتھ مقرر کیے۔ سورت اور مالوہ کے حکمرانوں کو اس کی مدد کا حکم جاری کیا۔ قلیچ خاں جو ہزار سپاہیوں پر امیر مقرر تھا اسے بھی امداد کے لیے بھیجا چنانچہ اس طرح بہت سے بہادر سپہ سالار جیسے رائے درگا، مدنی رائے، شیخ کبیر اور نصیب خاں، رحیم کے ہمراہ گجرات کے لیے روانہ ہوئے۔ ان کے علاوہ سید قاسم اور سید ہاشم بارہ بھی اس کے ساتھ تھے۔

دوسری جانب مظفر گجراتی نے بھی اپنے ساتھیوں اور اپنے رفیقوں کو جو اس جنگ میں اس کے شریک تھے اعزازات اور انعامات سے نوازا۔ جاگیریں اور روپیہ پیسہ تقسیم کیا۔ اپنے نام کے سکے ڈھالے۔ ایک بڑی فوج اس کے گرد جمع ہو گئی۔ کولی اور گجراتی بڑی تعداد میں اس کے ہمراہ تھے۔ ان

باغیوں نے احمد آباد سے کوچ کر کے بڑودہ کا محاصرہ کیا اور بیس دن کے محاصرہ کے بعد شہران کے قبضہ میں آگیا۔ بڑودہ کے گورنر قطب الدین محمد خاں کی وجہ سے بھی قلعہ اتنی جلدی فتح ہو گیا۔ اس نے مغلوں کے ساتھ غداری کی۔ مظفر گجراتی بڑودہ سے بڑوچ کی جانب بڑھا۔ آخر کار بڑوچ پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا جہاں قطب الدین محمد خاں کے خاندان کے افراد پناہ گزین تھے۔ مظفر کو بے پناہ دولت ہاتھ لگی۔ دس کروڑ اور چالیس لاکھ روپے نقد ہاتھ آئے۔ کہا جاتا ہے کہ مظفر ایک زمانہ میں آگرہ میں تھا جہاں بادشاہ تیس روپے ماہانہ اسے دیتا تھا۔ جب وہ وہاں سے فرار ہوا تو اس کے تن پر صرف اپنے کپڑے تھے آج وہ کروڑوں کا مالک تھا اور گجرات اس کے قدموں میں تھا۔ چالیس ہزار سپاہ اس کی کمان میں تھی۔

مظفر نے رحیم کی آمد کی خبر سنی تو وہ بڑوچ چھوڑ کر سیدھا احمد آباد پہنچا جہاں کوئی اس کی حفاظت کے لیے موجود نہیں تھا۔ خواجہ نظام الدین احمد پٹن میں موجود تھا جہاں سے وہ رحیم کو تمام خبریں بھیجتا رہتا تھا۔ اس نے رحیم سے جلد پہنچنے کی درخواست کی۔ وہ بہت جلد بھیل کے مقام پر پہنچ گیا جو جالور ضلع میں واقع تھا اور غزنی خاں کے قبضہ میں تھا۔ غزنی خاں مغلوں کا پرانا نمک خوار تھا۔ یہاں غزنی خاں رحیم سے آکر ملا۔ رحیم نے اس سے مدد کی درخواست کی۔ اس نے آناکانی کی۔ رحیم سمجھ گیا کہ اس کی نیت صاف نہیں۔ رحیم مارچ کرتا ہوا سروہی کے مقام پر پہنچا جہاں نظام الدین احمد اس سے آکر ملا اور اسے تمام واقعات سے مطلع کیا اور رحیم کو بڑی پھرتی کے ساتھ پٹن لیکر آگیا جہاں وہ ایک دن رہا۔ یہاں اس نے امرا کے ساتھ مشورہ کیا۔

کچھ امرا نے مشورہ دیا کہ فوج کم ہے (جو صرف آٹھ سے دس ہزار تھی) ابھی مقابلہ نہ کیا جائے اور دکن اور مالوہ سے مزید کمک آنے تک انتظار کیا جائے۔ مظفر نے چالیس ہزار فوج جمع کر رکھی تھی۔ اور اس وسیع فوج سے رحیم کے کیمپ میں خوف وہراس پھیلا تھا۔ بعض نے یہ بھی مشورہ دیا کہ پہلے بادشاہ کو اطلاع دیکر مزید فوج منگوائی جائے۔ رحیم کے ساتھ تجربہ کار بوڑھا سپہ سالار دولت خاں

لودی بھی تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ "بادشاہ کا بلانا مناسب ہے نہ قلیج خاں کا انتظار ضروری، قلیج خاں پرانا سپہ سالار ہے اگر وہ آگیا تو جنگ جیتنے کا سارا کریڈٹ اسے جاتے گا اور تم اور تمہاری فوج کو کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اگر چاہتے ہو کہ فتح کا ڈنکا تمہارے نام پر بجے تو یا قسمت یا نصیب۔ لڑ مرو اور یہ بھی سمجھ لو کہ بیرم خاں کے بیٹے ہو۔ جب تک خود تلوار نہ مارو گے خانخاناں نہ بنو گے۔ اکیلے ہی فتح کرنی چاہیئے اور گمنامی کے جینے سے ناموری کا جینا ہزار درجہ بہتر ہے۔"

بوڑھے سپہ سالار کی بات نوجوان رحیم کے دل میں اتر گئی۔ اس نے اعلان جنگ کر دیا۔ ڈپلومیسی کا ایک پینترہ بھی استعمال کیا۔ جھوٹ موٹ یہ خبر اڑائی کہ بادشاہ خود تشریف لا رہے ہیں۔ خیمہ میں خوشی کے شادیانے بجوا دیے تاکہ دشمن بھی سمجھ لے کہ کیا بات ہے۔ آخر کار مخالف کیمپ میں بھی یہ خبر پہنچ گئی۔ یہی مقصد تھا۔ دشمن کے سپاہیوں کی ہمت پست ہو گئی۔ اس کے بعد جنگ شروع ہوئی۔ احمد آباد سے تین کوس یعنی آٹھ کلو میٹر کے فاصلہ پر سرکھیج[1] کے مقام پر جو تاریخی اہمیت کا حامل ہے یہ جنگ ہوئی دراصل خواجہ نظام الدین احمد کی فوجیں جب رحیم سے آکر ملیں تو دشمن کے کیمپ نے یہ سمجھا کہ بادشاہ اکبر کی فوجیں پہنچ گئیں۔ یا شاید قلیج خاں آگیا۔ کئی روز تک مقابلہ ہوا۔ اس لڑائی میں سیّد ہاشم بارہ اور خضر اتکا جیسے مغل بہادر کام آتے۔ سینکڑوں لوگ زخمی ہوتے۔ یہ ممکن تھا کہ رحیم یہ جنگ ہار جاتا۔ لیکن اس کی قسمت کا ستارہ بلندی پر تھا۔ اتنی کم فوج کے مقابلہ میں اس نے جنگ جیت لی۔ اس کو قسمت ہی کہیں گے۔ مظفر کی فوج کے پاؤں

---

[1] سرکھیج آج بھی گجرات کے سیاحوں کے نقشہ پر ہے۔ یہ اپنی تاریخی عمارتوں کے لیے مشہور ہے۔ ایک تالاب کے گرد سلطان بیگھڑا اور اس کی رانی راجہ بائی کے مزارات ہیں۔ گجرات کے مشہور صوفی احمد گھٹو گنج بخش کا مقبرہ اور مسجد کی عمارتیں یہاں موجود ہیں۔ اس صوفی کے نام پر احمد آباد کا نام پڑا۔ سرکھیج کے فن تعمیر کی یہ نمایاں خصوصیت کہ یہاں کی عمارتوں میں کوئی محراب نہیں ہے۔ یہ خصوصیت اسے مغل فن تعمیر سے ممتاز کرتی ہے۔ سرکھیج کپاس اور نیل کی منڈی بھی ہے۔

اُکھڑ گئے۔ وہ بھاگ کھڑا ہوا اور کیمبے میں جا کر پناہ لی۔ کہا جاتا ہے اس جنگ میں مظفر کے دو ہزار سپاہی کام آئے۔ رحیم نے نماز شکرانہ ادا کی اور اکبر کے نام جنگ کی تفصیلی رپورٹ روانہ کی۔ رحیم دھوم دھام کے ساتھ احمد آباد میں داخل ہوا اور عام امن وسلامتی کا اعلان کیا۔ اور اس طرح سلطان مظفر کی مختصر حکومت کا خاتمہ ہو گیا جو صرف پانچ ماہ قائم رہی۔

مظفر میدان جنگ سے فرار ہو گیا مگر اس نے ابھی تک ہار تسلیم نہیں کی تھی۔ رحیم کے ساتھ ابھی اس کے کئی معرکے ہونے تھے۔ مظفر کیمبے پہنچا۔ اس کے ساتھ اس کے بہت سے جاں نثار موجود تھے۔ وہ عوام میں مقبول تھا۔ اس لیے بارہ ہزار کی فوج پھر اس کے گرد جمع ہو گئی۔ مالوہ اور دکن سے جو فوجیں قلیج خاں، نورنگ خاں اور تلک خاں کی قیادت میں آنے والی تھیں اور جن کی اتنی شہرت تھی وہ بڑودہ اس دن صبح پہنچی جس دن جنگ کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ رحیم نے انھیں بڑوچ میں رہنے کا حکم دیا اور خود مظفر کے مقابلہ کے لیے کیمبے کی جانب بڑھا۔ رحیم کے سامنے ایک بڑا چیلنج تھا۔ مظفر آگے آگے بھاگتا پھرتا اور رحیم اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ کبھی ایک پہاڑی میں چھپتا کبھی دوسری میں۔ کبھی اس جنگل میں جاتا کبھی دوسرے جنگل میں۔ چھوٹے موٹے مقابلے بھی ہوتے رہے آخر ناندود (ناندیڑ) کے مقام پر پھر سے دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور اس مقابلہ میں بھی مظفر کو شکست ہوئی اور وہ اپنی جان بچا کر بھاگا۔ اس معرکہ میں بھی ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ اکبر اس وقت الہ آباد سے آگرہ کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ راستہ میں اٹاوہ کے مقام پر اسے رحیم کی دوسری کامیابی کی خوشخبری ملی۔ اس نے وہیں خیمہ نصب کر دیے اور نماز شکرانہ ادا کی۔ سرکھیج اور ناندوڈ کی فتوحات کی خوشی میں بادشاہ نے رحیم اور اس کے ساتھیوں کو انعام واعزاز سے نوازا۔ ان کے منصب بلند کیے۔ رحیم کو "خان خانان" کا خطاب عطا ہوا۔ پانچ ہزاری منصب دیا گیا۔ خلعت، ہیرے جواہرات سے جڑی ہوئی برچھی اور ایک جھنڈا (تومان تغ) انعام میں دیے گئے۔ اس جھنڈے کے استعمال کی اجازت بہت کم امیروں کو دی جاتی تھی۔ اسی طرح اس کے سب سے جانباز اور وفادار ساتھی خواجہ نظام الدین احمد کی بے لوث خدمات

کا بھی اعتراف کیا گیا۔

خانخاناں نے اب گجرات کے نظم ونسق کی جانب توجہ دی۔ کچھ اصلاحیں نافذ کیں مگر ابھی تک مظفر اس کے لیے پریشان کُن بنا تھا۔ اس نے کاٹھیاواڑ میں پناہ لے رکھی تھی اور موقع کا منتظر تھا۔ خانخاناں پانچ سال تک گجرات کا گورنر رہا مگر وہ گجرات کی فتح کو اس وقت تک مکمل نہیں سمجھتا تھا جب تک مظفر زندہ اور مغرور تھا چونکہ وہ ابھی بھی برابر مغل سلطنت کے خلاف منصوبے بنا رہا تھا۔ کاٹھی قبیلہ اس کی مدد کر رہا تھا۔ اس نے جوناگڑھ کے راجہ امین خاں غوری سے مدد مانگی جس نے مظفر کو گونڈال ضلع دیدیا لیکن فوجی امداد کے لیے دو لاکھ "محمودی" (سکہ کا نام) طلب کیے جو مظفر نے اسے بھجوا دیے۔ اسی طرح اس نے دو لاکھ محمودی جھالا ور کے راجہ جام ستّا رسل کو دیے۔ جھالا ور، کاٹھیاواڑ کا ایک صوبہ کہلاتا تھا۔ مگر افسوس کہ وقت پر دونوں جاگیرداروں نے مظفر کو دھوکا دیا اور جب اس کا سامنا خانخاناں سے ہوا تو کوئی بھی اس کی مدد کے لیے نہیں پہنچا۔ جام تو کھلم کھلا خانخاناں سے جا ملا اور مظفر کی نقل وحرکت کی مخبری کرتا رہا۔ خانخاناں مظفر کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ مگر اس کا کہیں پتہ نہیں چل رہا تھا۔ مظفر جام کے علاقہ کو چھوڑ کر بائی کولیوں کے پاس جا چھپا اور بھاتی نام ایک کول سردار اس کی امداد کے لیے تیار ہوا۔ چنانچہ برانتی جی مقام پر مقامی لوگ جیسے کول بھومیار، گراسی اور دوسرے ناراض مقامی زمیندار مظفر سلطان کے گرد جمع ہو گئے اور شاہی فوجوں کے ساتھ جنگ ہوئی۔
راجہ جام کا طرز عمل خانخاناں کے ساتھ بھی ٹھیک نہیں رہا کیونکہ وہ خود اپنی حکومت قائم کرنے کا خواہاں تھا۔ مگر خانخاناں کو اس کے ارادوں کا پتہ چل گیا اور خانخاناں نے اسے بھی سبق سکھایا۔ مظفر پھر اس جنگ میں ہار گیا اور اس کے بعد سلطان مظفر کی طاقت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ عبدالرحیم خانخاناں نے عہد کیا تھا کہ مظفر پر فتح حاصل کرنے کے بعد جنگ سے حاصل تمام ساز وسامان اور دولت غریبوں اور ضرورتمندوں میں تقسیم کر دے گا۔ اس نے کچھ افسروں کو مقرر کیا کہ وہ مال کی قیمت آنک کر اس کے برابر روپیہ سپاہیوں میں تقسیم کر دے۔ کہا جاتا ہے کہ (بحوالہ بدایونی) یہ سب دھوکا تھا۔ خانخاناں نے اپنے چند وفادار امرا کو کہا کہ مال کی قیمت لگا دو اور روپیہ بانٹ

دو۔ ان وفاداروں نے اونے پونے داموں مال کی قیمت لگائی۔ خود بھی بہت سے مال پر قبضہ کرلیا۔ اور ضرورتمندوں کو برائے نام ہی ملا۔ اکبر نے جب جانا بیگم سے پوچھا تھا کہ باپ نے کتنا لٹایا تو بیٹی نے جواب دیا ستر لاکھ۔ یہ قصہ بہت مشہور ہے۔

اخیر میں ایک سپاہی آیا جس نے کہا کہ اسے کچھ نہیں ملا۔ خانخاناں کے پاس ہیرے جواہرات جڑا ہوا ایک قلمدان رہ گیا تھا۔ وہ بھی اس نے اس سپاہی کے حوالہ کر دیا۔ اس فتح اور اس کی فراخدلی کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اس خوشی میں رحیم نے سرکھیج کے مقام پر ایک باغ بھی لگوایا۔ جس کا نام باغ فتح رکھا۔

اس جنگ کے دوران خانخاناں کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ بہت سے بزرگ امرا تھے۔ جنھیں یہ شکایت رہتی تھی کہ خانخاناں انکی خاطر خواہ عزت نہیں کرتا اور انہیں ان کے مرتبہ کے مطابق انعام و اکرام بھی نہیں دیتا۔ خانخاناں نے ان کی شکایات سنیں اور انہیں خلعت وانعام سے نوازا۔ اپنے زمانہ گجرات میں کبھی کبھی وہ ان بزرگوں کی ریشہ دوانیوں سے اس درجہ پریشان ہو جاتا کہ آگرہ واپس جانے کے بارے میں سوچتا۔ ابوالفضل سے اس کی خط وکتابت رہتی تھی۔ ان خطوں میں وہ اپنی پریشانیوں اور واپس بلانے کا ذکر کرتا ہے۔ ابوالفضل سے بادشاہ کے سامنے سفارش کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ ایک خط میں اس نے لکھا کہ وہ بادشاہ سے کہہ کر کم از کم ٹوڈرمل کو گجرات بھجوا دے جو اس کا دوست تھا۔

گجرات کی فتح کے چھ ماہ بعد ۱۵۸۵ء میں رحیم کو واپس دربار میں طلب کر لیا گیا اور گجرات میں قلیج خاں کو جانشین بنا کر، وہ بہت تیز رفتاری سے فتح پور سیکری پہنچ کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

اکبر بادشاہ اسے پنجاب کی مہم پر لے گیا جہاں کابلی پریشانی کھڑی کر رہے تھے۔ سرائے آباد میں راجہ ٹوڈرمل کے بناتے ایک تالاب پر انھوں نے کچھ دن قیام کیا۔ یہاں خانخاناں نے بادشاہ سے پھر گجرات جانے کی اجازت مانگی۔

گجرات میں مظفر گجراتی نے پھر سے اپنی طاقت مجتمع کرلی تھی اور وہ احمد آباد پر قبضہ

کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ راجہ جام اس کا ساتھ دے رہا تھا اور اس نے مظفر کو پہلے جوناگڑھ پر قبضہ کرنے کا مشورہ دیا۔ شاہی فوجوں کو جب اس سازش کی اطلاع ملی تو وہ وہاں پہنچی اور مظفر فرار ہونے پر مجبور ہوا۔

خانخاناں کو مظفر گجراتی کے علاوہ کئی مقامی راجاؤں جیسے جام اور جالور کے غزنی خان سے بھی مقابلہ تھا۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ جالور کے راجہ غزنی خاں نے خانخاناں کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ اپنے وعدہ پر قائم نہیں رہا۔ وہ دو عملی سے کام لے رہا تھا۔ خانخاناں کو اس کے منصوبوں کا بخوبی علم تھا۔ چنانچہ اس نے غزنی خاں کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا اور جب غزنی خاں خانخاناں کے پاس آیا تو شاہی سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ وہ شاہی قیدی تھا اس لیے خانخاناں نے اسے چاندی کی زنجیروں میں جکڑا اور جالور پر قبضہ کر لیا۔

خانخاناں کی کوششوں سے اب گجرات میں امن قائم ہو گیا تھا۔ بادشاہ نے اسے واپس بلانے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے لکھا ''چونکہ گجرات اب پر امن ہے۔ اس لیے سپہ سالار خانخاناں کو چاہیئے کہ واپس دربار میں آجائے اور صوبہ کے معاملات کو عزدوالدولہ۔ قلیج خاں اور خواجہ نظام الدین احمد کے حوالہ کر دے یا اگر وہ مناسب خیال کرے تو خود وہاں رہے اور قلیج خاں اور نظام الدین احمد کو دربار میں بھیجدے۔ خانخاناں پہلے ہی گجرات سے اُکتا چکا تھا۔ قلیج خاں کو اپنا نائب مقرر کر کے ۱۵۸۷ء میں واپس دارالخلافہ آگیا اور پھر اس نے گجرات کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ بعد میں مرزا عزیز کو کلتاش خانِ اعظم کو گجرات کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔

مظفر گجراتی کا عبرتناک انجام ہوا جو خانخاناں کا کٹر دشمن تھا اور جس نے اس کے ساتھ دس سال کے عرصہ میں متعدد جنگیں لڑیں۔ خانخاناں اس کا پیچھا کرتا رہا اور وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپتا پھرتا تھا۔ آخر کار ضلع نوانے نگر کے ایک چھوٹے سے گاؤں دھرول کے مقام پر اس نے ۱۵۹۳ء میں خود اپنی گردن کاٹ کر خودکشی کر لی اور اس طرح ایک نہایت بہادر اور باہمت جنگجو کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

اکبر کشمیر کی سیاحت کے لیے گیا۔ جو اس کی دیرینہ خواہش تھی۔ اس سفر میں خانخاناں اور شہزادہ مراد بھی اس کے ساتھ تھے۔ کشمیر میں اکبر نے فطرت کے لازوال

حُسن کو دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ اس نے خواہش ظاہر کی کہ حرم کی خواتین بھی اس کے ساتھ ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ خانخاناں اور شہزادہ مراد کو خواتین کو لینے بھیجا۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے راستے خراب تھے اور خواتین نہ آسکیں۔ بادشاہ بددِل ہوا۔ بادشاہ کی خواہش پر خانخاناں تنہا پھر گیا اور بڑی مشکلات کے ساتھ بادشاہ کی خواہش کو پورا کیا۔

کشمیر سے واپسی پر اکبر کابل گیا جہاں اس نے دو ماہ سیرو سیاحت میں گزارے۔ تاریخی مقامات اور باغوں کی سیر کی جو اس کے دادا بابر کی یادگار تھے۔ بابا کے مزار کی بھی زیارت کی۔ خانخاناں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اسی سفر میں خانخاناں نے واقعات بابری کا ترکی زبان سے فارسی میں ترجمہ مکمل کیا اور جب بادشاہ نے ہندوستان واپسی پر بارک آباد مقام پر پڑاؤ کیا تو اس کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور خانخاناں کی بڑی تعریف کی۔

اسی دوران ۱۵۸۹ء میں ٹوڈرمل کا انتقال ہوا تو بادشاہ نے خانخاناں کو اس کی جگہ وکیل سلطنت مقرر کیا۔ دراصل اب یہ عہدہ ایک اعزازی عہدہ تھا اس کا باپ بیرم خاں جب وکیل تھا تو وہ ایک بااختیار وزیر اعظم تھا۔ اکبر کے زمانہ میں وزارت عظمیٰ نمائشی اور اعزازی رہ گئی تھی اور انتظامی معاملات وکیل میں نہیں ہوتے تھے۔ یہ نہیں معلوم کہ خانخاناں جیسے فعال سپہ سالار کو یہ عہدہ دے کر بادشاہ نے اسے ہزادی بھی با عزت افزائی کی تھی۔ یہ عہدہ بھی اس کے پاس چند ماہ سے زیادہ نہیں رہا۔ اس عہدہ سے الگ کر کے اسے جونپور کی جاگیر کا انتظام سپرد کیا گیا جہاں وہ کچھ عرصہ رہا۔ کہا جاتا ہے کہ یہیں، گوسوامی تلسی داس سے اس کی ملاقات ہوئی جس کی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے۔

۵

سندھ میں معرکہ آرائیاں

کابل وقندھار سے مغلوں کا سیاسی رشتہ منقطع ہو چکا تھا اگرچہ وہ ان علاقوں کو ابھی بھی ممالک موروثی سمجھتے تھے اور چاہتے تھے ان کے قبضے میں آجائیں اور بعد میں اکبر کابل وقندھار کو سلطنت مغلیہ کا حصّہ بنانے میں کامیاب بھی ہوگیا۔ قندھار خاص طور پر ہندوستان کا دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے اس پر تسلط ایک سیاسی ضرورت بھی تھی۔ اکبر جب تک سلطنت کے داخلی معاملات میں گھرا رہا اس نے شمال سرحدی علاقوں کی طرف توجہ نہیں دی۔ اب اسے فرصت نصیب ہوئی تو اس نے اس طرف توجہ دی۔ مغلوں کی جہاں بانی و جہاں رانی کی فطری تمنا بھی ایک سبب تھی۔ اکبر کو بہانہ بھی مل گیا تھا۔

مرزا محمد باقی ترکھان سندھ کا حکمراں تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا پوتا مرزا جانی بیگ اس کا جانشین مقرر ہوا۔ ترکھان ان کا لقب تھا۔ ارغون قبیلہ سے ان کا تعلق تھا اور چنگیز خاں سے اپنا نسلی رشتہ جوڑتے تھے۔ مرزا جانی بیگ آزادانہ طبیعت کا مالک تھا اور شاہی دربار کی زیادہ پرواہ نہیں کرتا تھا۔ بادشاہ کے حکم کے باوجود اس نے کبھی دربار میں حاضری نہیں دی جبکہ اس کے باپ دادا مغلوں کے مطیع و فرمانبردار رہتے تھے۔ مرزا جانی بیگ سے ایک شکایت اور بھی تھی۔ اس نے ہمایوں کو بہت تنگ کیا تھا۔ اکبر نے اسے سبق سکھانا ضروری سمجھا اور ایکبار پھر اس مہم کے لیے عبدالرحیم خانخاناں کا انتخاب کیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اکبر خانخاناں کو پہلے قندھار فتح کرنے کے لیے بھیجنا چاہتا تھا مگر خانخاناں وہاں جانے کے لیے تیار نہیں تھا اور وہ جب بادشاہ کے مجبور

کرنے پر جانے کے لیے تیار ہوا تو راستہ میں سندھ ہی میں اُلجھ کر رہ گیا اور قندھار نہیں جا سکا۔ تاہم سندھ کی اس مہم کا آغاز جنوری ۱۵۹۰ء میں ہوا۔ ٹھٹھہ ایک تاریخی اور بارونق شہر تھا جو سندھ کا دروازہ بھی تھا جنگ کا پہلا نشانہ بنا۔

خانخاناں بڑی شان وشوکت کے ساتھ لاہور سے روانہ ہوا بادشاہ خود ایک منزل تک براستہ دریا اسے رخصت کرنے کے لیے آیا۔ بادشاہ نے اسے بلوچستان پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ خانخاناں نے سیدھا اور مختصر راستہ اپنانے کی بجائے لمبا راستہ اختیار کیا جو ملتان اور بھکّر سے گزرتا تھا۔ یہاں اس نے بادشاہ کی مرضی کے خلاف اپنے جنگی منصوبہ میں تبدیلی کی اور اپنی مرضی کے مطابق عمل کیا۔ اس کے علاوہ خانخاناں یہ بھی چاہتا تھا کہ قندھار پر حملہ کرنے سے پہلے اس کے پاس کچھ اور ساز وسامان، دولت اور فوج جمع ہو جائے اور قندھار کے تئیں اس کی بد دلی بھی ایک وجہ تھی کہ اس نے جان بوجھ کر سندھ میں معرکہ آرائی کو طول دیا ہوگا۔

خانخاناں جب ٹھٹھہ کے مقام پر پہنچا تو مرزا جانی بیگ کے سفیر خیر سگالی کا پیغام لے کر اس کے پاس حاضر ہوتے مگر خانخاناں نے صلح جوئی کی بجائے مقابلہ کا راستہ اپنایا اور مرزا کے سفیروں کو قید کر لیا۔

سندھ میں گجرات کے مقابلہ میں منظر نامہ مختلف تھا۔ یہاں زیادہ دشواریاں تھیں۔ خانخاناں یہاں کے جغرافیائی اور سماجی حالات سے ناواقف تھا۔ پھر یہ کہ اس جنگ میں پہلی بار کشتیوں اور جہازوں کا استعمال کیا گیا۔ خانخاناں کو کئی بار پسپائی کا سامنا کرنا پڑا اور کئی بار بادشاہ سے کمک اور مدد مانگنی پڑی۔ بادشاہ نے لاکھوں روپیہ اور لاکھوں من جنس فوج کے لیے روانہ کی۔ یہاں خانخاناں کو طوفان باد وباراں کا بھی سامنا کرنا پڑا اور ایک غیر ملکی طاقت پرتگالیوں سے بھی نبرد آزمائی کرنی پڑی۔

پہلے حملہ میں خانخاناں نے لکّی کو تو حاصل کر لیا جو سندھ کی فتح کی کنجی سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں لکّی کو خاص جغرافیائی اور جنگی حیثیت حاصل تھی جس طرح کشمیر کے لیے بارہ مولہ یا بنگال کے لیے گڑھی تھے اسی طرح لکی کا درجہ سندھ کے لیے تھا۔ اصل معرکہ تو سہوان یا سیوان کے مقام پر ہوا جہاں ایک جنگی قلعہ تھا۔ خانخاناں نے اس

کا محاصرہ کیا۔ قلعہ پہاڑی پر واقع تھا۔ اس کے چاروں طرف چالیس گز خندق تھی جو پانی سے بھری رہتی تھی۔ سات گز چوڑی فصیل بنی تھی۔ دریا کی تین شاخیں یہاں آکر ملتی تھیں جنہوں نے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ قلعہ کیا تھا ایک جزیرہ تھا۔ اس قلعہ کا فتح کرنا لوہے کے چنے چبانا تھا۔ خانخاناں کو کتی بار شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مرزا جانی بیگ کا بحری بیڑا بھی بڑا مضبوط تھا۔ اس کے پاس بارہ ہزار گھوڑ سوار تھے۔ سو کے قریب سمندری جہاز تھے جنہیں غراب کہا جاتا تھا۔ دو سو کشتیاں تھیں جن میں تیرانداز اور بندوقچی سوار تھے۔ خانخاناں کے ساتھ جہاں آزمودہ کار مغل جنگجو تھے، صرف بارہ سو گھوڑ سوار تھے۔ کچھ غراب اور کشتیاں تھیں۔ جن میں بعد میں اضافہ ہوا۔ مغل ہمیشہ کم فوج کے ساتھ بڑی فوج پر فتح پاتے رہے تھے۔ اس کی وجہ ان کی اقبال مندی اور بلند حوصلگی تھی۔ یہ جنگ بھی خانخاناں نے جیت لی۔ سہوان کا قلعہ بھی اس کے قبضہ میں آگیا اور مرزا جانی فرار ہونے پر مجبور ہوا۔ گجرات میں جس طرح مظفر گجراتی بار بار پسپا ہو کر بھی پھر سر اُبھارتا تھا یہی صورت سندھ میں مرزا جانی کی تھی۔ اسے بھی عوام کی حمایت حاصل تھی۔ غالباً مغلوں کو غیر ملکی سمجھا جاتا تھا اور یہ مقامی حکمراں تھے؛ علاقائیت اس زمانہ میں بھی ایک فیکٹر تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اگر طوفانِ باد و باراں نہ آگیا ہوتا اور مرزا جانی کے تمام راستے نہ ہو گئے ہوتے تو اس کو شکست نہ ہوتی۔ یہ جنگ وہ جیت جاتا۔

سہوان کی یہ جنگ ڈیڑھ سال تک جاری رہی جس میں فریقین کا بے شمار جانی و مالی نقصان ہوا۔ روزانہ جنگ ہوتی تھی اور ہر روز سیکڑوں آدمی مارے جاتے تھے۔ کبھی کبھی رسد کی اس درجہ کمی ہو جاتی تھی کہ مردہ گھوڑوں کا گوشت کھانا پڑتا تھا۔ راجہ ٹوڈرمل کا بیٹا' دھارو بھی اس جنگ میں شریک تھا اور وہ لڑتے لڑتے مارا گیا۔ مرزا جانی آخرکار صلح کرنے پر مجبور ہوا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ صلح کے معاہدہ پر دستخط کرنے سے پہلے اس نے اپنے باپ مرزا پائندہ بیگ اور بیٹے مرزا فتح کو لکھا کہ وہ ٹھٹھہ شہر کو قطعی مسمار کر دیں اور اپنے خاندان کے افراد اور عوام کو کلاں کوٹ بھیج دیں۔ یہ شہر جو قلعہ بند تھا اسی مقصد کے لیے بنوایا تھا۔ اسی دوران مرزا جانی کے باپ اور بیٹے دونوں کا انتقال ہو گیا۔ مرزا جانی کے سامنے سوائے صلح کے

اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے حکم جاری کیا کہ تمام قلعوں کی چابیاں خانخاناں کے سپرد کر دی جائیں۔

۱۷ اگست ۱۵۹۱ء کو محاصرہ اٹھا لیا گیا جو جنوری ۱۵۹۰ء میں شروع ہوا تھا یعنی پورے ڈیڑھ سال بعد۔ خانخاناں نے مکمل رپورٹ بادشاہ کی خدمت میں ارسال کی۔ خانخاناں نے کچھ عرصہ سہوان کے قریب ایک گاؤں میں قیام کیا اور پھر ٹھٹھہ کے لیے روانہ ہوا۔ سردی کا آغاز ہو چکا تھا۔ جب مغل فوجیں فتح باغ پہنچیں تو مرزا جانی بیگ خانخاناں کے استقبال کے لیے وہاں پہنچا۔ دونوں ایکدوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ صلح کی شرطیں طے ہوئیں۔ شرطوں کے مطابق مرزا جانی کو اپنی ایک بیٹی کی شادی خانخاناں کے بیٹے مرزا ایرج کے ساتھ کرنی پڑی اور خوں ریز جنگ کے بعد شادی کے شادیانے بج اٹھے۔ سہوان کا قلعہ بھی مغلوں کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ بھی طے پایا کہ مرزا جانی مغل دربار میں حاضری دے گا اور معاہدہ کی چوتھی شرط کے مطابق بیس جنگی جہاز (غراب) بھی خانخاناں کو دیدیے گئے۔

ہندوستان کی یہ پہلی بحری جنگ تھی جس میں سمندری جہازوں کا استعمال کیا گیا اور یہ پہلی جنگ تھی جس میں کسی یورپی طاقت نے حصّہ لیا تھا۔ خلیج فارس میں ہرمز بندرگاہ میں پرتگالی بیڑے موجود رہتے تھے۔ سندھ میں پرتگالیوں کا ایک ایجنٹ مستقل قیام پذیر تھا جو اس علاقہ میں اپنے تجارتی مفادات کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس ایجنٹ نے اس جنگ میں حصہ لیا تھا۔ ابھی تک ان لوگوں کی سرگرمیاں تجارت تک محدود تھیں۔ سندھ میں پہلی بار انھوں نے سیاست میں حصّہ لیا۔ اس سے ان کی بڑھتی طاقت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کو یہ بھی ڈر تھا کہ مغلوں کے تسلط سے ان کی تجارت کو نقصان پہنچے گا۔ اکثر ان کے خلاف مغل دربار میں شکایتیں پہنچتی رہتی تھیں۔ اکبر نے کئی بار تادیبی کارروائی بھی کی۔ اسی لیے پرتگالیوں نے مرزا جانی کا ساتھ دیا۔ مرزا جانی ان کی طاقت پر بہت بھروسہ کرتا تھا۔ معاہدہ کی رو سے اسے مغل دربار میں حاضر ہونا تھا مگر وہ نہیں گیا۔ اسے یہ امید تھی کہ پرتگالیوں کی مدد سے وہ ایکدن مغلوں کو مار بھگائے گا۔

لیکن آخر کار وہ دربار میں حاضر ہونے مجبور ہوا۔ بادشاہ کی دلی خواہش

پوری ہوتی۔ شاید بادشاہ اس کی ذاتی خوبیوں سے متاثر بھی رہا ہوگا۔ دربار میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوتی۔ اسے پنج ہزاری منصب دار بنا یا گیا۔ ملتان اور ٹھٹھہ اسے واپس کر دیے گئے اور وہ اب باقاعدہ امرا میں شامل ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے دین الٰہی بھی قبول کر لیا تھا۔ اسے دکن کی مہم پر بھی بھیجا گیا جہاں جنوری ۱۶۰۱ء میں برہان پور کے مقام پر دماغ کی رگ پھٹ جانے سے انتقال ہو گیا جس کی وجہ کثرت شراب نوشی تھی۔

مرزا محمد جانی ایک بہادر سپہ سالار کے ساتھ ایک عالم، ادیب اور شاعر بھی تھا۔ موسیقی سے دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ مہذب اور سنجیدہ انسان تھا۔ بچپن سے شراب کی لت میں مبتلا تھا۔ خوبی یہ تھی کہ شراب پی کر بہکتا نہ تھا۔ کوئی بیہودہ حرکت بھی نہ کرتا۔ اگرچہ کثرت سے شراب پیتا تھا۔ دوسرے وہ کسی کے سامنے نہیں بلکہ گوشہ تنہائی میں پیتا تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کی جاگیر اس کے بیٹے محمد غازی کو دیدی گئی۔

ملا شکیبی، عبدالرحیم خانخاناں کے دربار کا ایک مشہور شاعر تھا۔ اس نے سندھ کی جنگ پر ایک مثنوی لکھی تھی جس کا ایک شعر تھا ؎

ہمائے کہ بر چرخ کردی خرام
گرفتی و آزاد کردی زدام

(ہما جو آسمان کی بلندیوں میں پرواز کر رہا تھا، اسے پکڑ تو لیا مگر پھر آزاد بھی کر دیا)
اشارہ مرزا محمد جانی کی طرف تھا۔ یہ مثنوی شکیبی نے ایک محفل میں پڑھ کر سنائی جس میں خانخاناں اور مرزا محمد جانی دونوں موجود تھے۔ خانخاناں نے ایک ہزار اشرفیاں انعام میں شاعر کو پیش کیں۔ مرزا جانی نے بھی ایک ہزار اشرفیاں شاعر کو دیں یہ بات دربار کے آداب کے خلاف تھی۔ کسی کی محفل میں دوسرے شخص کا انعام دینا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مرزا جانی کے اس اقدام پر لوگوں نے سوال کیا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ مرزا جانی نے جواب دیا۔ شاعر نے اسے ہما کہا تھا اگر وہ اسے الّو کہدیتا تو اس کا کیا کر لیتا۔ اس لیے اس نے بھی اسے انعام دینا ضروری سمجھا۔ گجرات اور سندھ کی جنگوں نے خانخاناں کو پختہ کار سپہ سالار بنا دیا تھا۔ اب ان سے بھی بڑا معرکہ اس کا منتظر تھا۔

❋

(۶)

خانخاناں دکن میں

I پہلا مرحلہ

وندھیاچل اور نربدا کے جنوب میں پھیلا ہوا ہندوستان دکن کہلاتا ہے۔ دکن ابتدا سے مسلم حکمرانوں کی توجہ کا مرکز رہا۔ جہاں بانی کی خواہش نے علاؤالدین خلجی کو دکن پر حملہ کرایا۔ اس کا سپہ سالار ملک کافور جنوبی ہند کے آخری کنارے مدورائے تک پہنچ گیا تھا۔ محمد بن تغلق نے تو جنوبی ہند کے بیشتر علاقہ کو اپنی سلطنت کا حصہ بنالیا تھا۔ میسور اور مالابار تک پر اس کی حکومت قائم ہوگئی تھی۔

مگر دہلی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے پر دکن میں چھوٹی چھوٹی خود مختار اور آزاد ریاستیں قائم ہوگئی تھیں۔ احمد نگر دکن کی سب سے زیادہ بڑی اور طاقتور ریاست تھی جس پر نظام شاہی خاندان حکمراں تھا۔ بیجاپور جو احمد نگر کے جنوب میں واقع ہے نسبتاً چھوٹی ریاست تھی۔ ۱۴۸۹ء میں اسے یوسف عادل شاہ نے قائم کیا تھا۔ اس ریاست کے حکمراں عادل شاہی کہلاتے تھے۔ گولکنڈہ ان دونوں میں سب سے کمزور ریاست تھی۔ یہاں شروع میں قطب شاہ نام کا ایک شخص صوبیدار تھا۔ اس نے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کرکے گولکنڈہ کو ایک علیحدہ ریاست بنا دیا تھا۔ یہ ریاست کرشنا اور گوداوری کے بیچ اور اڑیسہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس ریاست کے حکمراں قطب شاہی کہلاتے تھے۔ چوتھی ریاست بیدر تھی جو متذکرہ بالا تینوں ریاستوں سے چھوٹی تھی۔ یہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے بیچ میں واقع تھی جس پر بہمنیوں کی حکومت قائم تھی۔ دکن کی پانچویں ریاست برار تھی جو بہمنی سلطنت کا حصہ تھی مگر ایک سردار فتح اللہ شاہ نے بہمنیوں سے لڑ کر اسے آزاد کرالیا تھا۔ یہ گوداوری دریا

کی معاون ندیوں کے درمیان واقع تھی۔

پانچوں ریاستوں میں اوّل دو ریاستوں۔ احمد نگر اور بیجاپور کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ یہ دونوں سب سے بڑی ریاستیں بھی تھیں۔ دکن کی یہ پانچوں ریاستیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ اکبر یہاں امن و امان قائم کرنا چاہتا تھا لیکن دکن پر اس کے حملہ کی یہ وجہ نہ تھی۔ شمال و مغرب کا جب بیشتر حصّہ اس کے زیرِ نگیں آگیا تو اسے دکن کا خیال آیا۔ اکبر کی سلطنت کو وسیع تر کرنے کی خواہش دکن میں اس کی دخل اندازی کی واحد وجہ نظر آتی ہے۔ آنے والے مغل بادشاہوں نے اکبر کی اس پالیسی کو کسی نہ کسی حد تک جاری رکھا۔ اورنگ زیب کی زندگی کے ۲۵ سال تو دکن میں ہی گزر گئے۔ دیکھا جاتے تو بہت سے عوامل میں مغلوں کی دکنی پالیسی مغل سلطنت کے زوال کا ایک اہم سبب تھی۔

احمد نگر میں مرتضیٰ نظام شاہ حکمراں تھا۔ ۱۵۸۸ء میں خود اس کا بیٹا میران حسین باپ کو قتل کر کے تخت نشین ہوتا ہے۔ مگر چند ماہ بعد اسے بھی قتل کر دیا جاتا ہے اور برہان الملک کے بیٹے اسماعیل کو گدی پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ برہان الملک، مرتضیٰ نظام شاہ کا بھائی تھا، برہان الملک کو اکبر بادشاہ دربار میں بلاتا ہے اور دکن میں اپنا اثر قائم کرنے کے لیے اس سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ یہاں سے اکبر کی دکن پالیسی کا آغاز ہوتا ہے۔ اکبر نے سوچا کہ اگر برہان الملک مغل فوجوں کی مدد سے احمد نگر کا حکمراں بن جاتا ہے تو وہ اکبر کا خراج گزار رہے گا اور وہ اس کی مدد سے دکن کی دوسری ریاستوں پر اپنا تسلّط قائم کر سکے گا۔ اکبر نے برہان الملک کی مدد کی اور وہ احمد نگر کا حکمراں بن گیا۔ مگر اکبر کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ بادشاہ بنتے ہی برہان الملک نے اکبر کی ایک نہ سُنی۔ اس نے مغلوں کا تسلّط تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اکبر جب اپنے اس منصوبہ میں ناکام ہو گیا تو اس نے احمد نگر اور دکن کی دوسری ریاستوں میں اپنے سفیر روانہ کیے۔ دکن پر فتح حاصل کرنے کی تیاری کا یہ دوسرا قدم تھا۔ شیخ فیضی کو احمد نگر برہان الملک کے پاس روانہ کیا۔ برہان الملک نے فیضی کا گرمجوشی سے استقبال کیا اور خوب خاطر مدارات بھی کی مگر سیاسی کوئی وعدہ نہیں کیا۔ دوسری ریاستوں میں بھیجے گئے مشن بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ کوئی ریاست بھی مغلوں کی

بالا دستی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔

چنانچہ اکبر نے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۵۹۳ء میں اس نے ایک جنگی کونسل طلب کی جس میں شہزادہ دانیال کو دکن کی کمان سپرد کی۔ مگر بعد میں جب بادشاہ نے خانخاناں سے مشورہ کیا تو اس نے یہ ذمہ داری قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ بادشاہ خود بھی یہی چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور اب خانخاناں کو دکن مہم کا انچارج بنا دیا۔ مالوہ کے جاگیردار مرزا شاہ رُخ۔ اجمیر کے صوبیدار شہباز خاں اور شہزادہ مراد جو گجرات کا صوبیدار تھا حکم دیا کہ وہ خانخاناں کی مدد کریں۔ خانخاناں کو بھلسہ کی جاگیر عطا کی گئی۔ نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ بادشاہ نے خانخاناں کو دکن کی مہم پر روانہ کیا۔

ادھر دکن کی ریاستیں برابر ایک دوسرے کے ساتھ برسرپیکار تھیں۔ احمد نگر میں برہان الملک نے اپنے بیٹے ابراہیم کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ مگر اس کے سپہ سالار اخلاص خاں حبشی نے مخالفت کی اور خود اپنے بیٹے کو گدّی کا دعویدار بنایا اور برہان الملک کے خلاف بغاوت کر دی۔ برہان الملک کو خود اپنی ہی فوجوں کے خلاف لڑائی لڑنی پڑی۔ صرف چار سال حکومت کرنے کے بعد برہان الملک کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا ابراہیم نظام شاہ کے نام سے تخت پر بیٹھا۔ اس کی عمر صرف تیرہ چودہ سال تھی۔ میاں منجو سلطنت کا وزیر اعظم تھا جو بادشاہ کے نام پر خود حکومت کرنے لگا۔

بیجاپور کے سلطان نے نئے بادشاہ کو مبارکباد دینے کے لیے احمد نگر اپنا سفیر بھیجا۔ خلاف معمول بیجاپور میں احمد نگر کے سفیر کی بے عزتی کی گئی۔ بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ نے اس بے عزتی کا بدلہ لینے کی ٹھان لی اور احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ ابراہیم عادل شاہ اس جنگ میں مارا گیا۔ میاں منجو شکست کھا کر احمد نگر پہنچا اور وہاں برہان الملک کے پڑپوتے احمد کو جو ابھی بارہ برس کا تھا تخت پر بٹھایا۔ ابراہیم کے چھوٹے بیٹے بہادر کو جو واحد جانشین تھا جیل میں بند کر دیا۔ اخلاص خاں حبشی نے احمد کو احمد نگر کا سلطان تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ بیجاپور میں علی عادل شاہ کی بیوہ چاند بی بی آرام سے زندگی گزار رہی تھی۔ وہ برہان الملک کی بہن تھی اور اس طرح احمد نگر کے تخت کی حقدار تھی۔ اخلاص خاں حبشی نے چاند بی بی کو بہادر کی حمایت

کے لیے آمادہ کرلیا۔ اس طرح میاں منجو اور اخلاص خاں کے درمیان جھگڑا کھڑا ہوگیا منجو میاں نے شہزادہ مراد کو خط لکھا کہ وہ اس کی مدد کے لیے آئے۔ ادھر خانخاناں مانڈو میں ٹھہرا تھا۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے وہ آگے نہیں بڑھ پا رہا تھا۔ مراد خانخاناں سے حسد رکھتا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ خانخاناں دکن کی مہم پر جائے۔ اس پر وہ اپنا حق جتاتا تھا اور چاہتا تھا کہ تمام سپہ سالار اس کی کمان میں دکن کی جنگ لڑیں۔ منجو میاں کا خط پاتے ہی مراد دکن کے لیے روانہ ہوا۔ اس نے خانخاناں کو اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

اُدھر خانخاناں بھلسہ میں مقیم تھا جہاں سے وہ اجین کے لیے روانہ ہوا۔ جہاں مرزا شاہ رخ اس سے آکر ملا۔ یہاں سے وہ دونوں مانڈو کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں شہباز خاں اپنی فوجیں لے کر آگیا۔ مراد کو جب یہ اطلاعات ملیں تو وہ بہت برہم ہوا اور خانخاناں کو فوراً آنے کے لیے لکھا۔ خانخاناں نے جواب میں لکھا کہ اسے خاندیش سے مزید فوجوں کا انتظار ہے۔ یہ فوجیں ملنے پر وہ اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ مزید یہ بھی لکھا کہ اس دوران وہ شکار سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ شہزادہ اس جواب سے اور بھی چراغ پا ہوا۔ ان باتوں سے شہزادہ اور خانخاناں کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع ہوگئی۔ مراد احمد آباد سے سیدھا احمد نگر بڑھ رہا تھا۔ خانخاناں مالوہ سے روانہ ہوا۔ خاندیش کا راجہ علی خاں تھا جس کی راجدھانی مانڈو تھی۔ وہ ایک بہادر اور طاقتور حکمراں تھا۔ دکن کا راستہ خاندیش سے ہو کر گزرتا تھا۔ اس لیے اس کے صوبہ کو ایک اہم جغرافیائی حیثیت حاصل تھی۔ خانخاناں نے راجہ علی خاں کو اپنے ساتھ ملالیا۔ جو اس کی ڈپلومیسی کا ایک بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نے حلف وفاداری اٹھایا۔ اکبر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور سکہ ڈھالا گیا۔ خود راجہ خاں اپنی فوجوں کو لے کر خانخاناں کے ہمراہ دکن کی جانب بڑھا۔ خانخاناں نے خاندیش واپس اسے جاگیر میں دیدیا اور پنج ہزاری منصب دار مقرر کیا۔ خانخاناں نے بادشاہ کو مطلع کرتے ہوئے اپنے ان اقدامات کی توثیق چاہی۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور نہ صرف یہ کہ اس نے توثیق کر دی بلکہ خانخاناں کو مزید انعام واکرام سے بھی سرفراز کیا۔

دراصل مالوہ دکن کا دروازہ سمجھا جاتا تھا اور دکن میں کامیابی کے لیے اس علاقہ پر قبضہ ضروری تھا۔ خانخاناں اس کی اہمیت کو سمجھتا تھا۔ مالوہ کے جائے وقوع پر غور کریں تو اس کی جنگی افادیت کا اندازہ ہوگا۔ مالوہ کے ایک جانب گجرات ہے تو دوسری جانب دلّی اور تیسری جانب دکن۔ مالوہ کو غیر معمولی مرکزیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ یہ علاقہ اپنی غیر معمولی شادابی اور خوشگوار آب وہوا کے لیے بھی مشہور ہے۔ اسی لیے ہمایوں کو مالوہ بہت پسند تھا اور وہ یہاں اکثر آرام کے لیے آیا کرتا تھا۔ خانخاناں کو بھی یہ جگہ بہت پسند آئی اسی وجہ سے۔ شاید اس نے دکن کے سفر کو موخر کیا ہو اور جس کی وجہ سے مراد اس سے ناراض ہوگیا۔ خانخاناں اب مزید اختلاف کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے تیزی سے چلکر احمد نگر کے قریب شہزادہ کے سامنے حاضر ہوا۔ مغلوں میں اکثر کمان شہزادہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور سپہ سالار اس کے ماتحت ہوتا تھا۔ یہاں بھی یہی صورت حال تھی۔ شہزادہ اصل میں جنگ کا انچارج تھا۔ لیکن اس کو کیا کہیے کہ فن سپہ گری میں خانخاناں کا پلّہ بھاری تھا اور وہ ایک کمزور شہزادہ کے ماتحت کام کرنے میں دشواری محسوس کررہا تھا۔

شہزادہ، خانخاناں سے اس درجہ ناراض تھا کہ اس نے ملنے تک سے انکار کردیا۔ کئی روز تک نامہ وپیام کا سلسلہ چلتا رہا۔ آخرکار شہزادہ نے سپہ سالار کو معاف کردیا اور حاضری کی اجازت دیدی۔

خانخاناں کی مہم کانٹوں سے بھری سیج تھی۔ مغل فوج میں بھی امرا وافسر آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ ایک طرف شہزادہ اور خانخاناں کی نہیں بنتی تھی تو دوسری طرف شہباز خاں اور صادق خاں کا ایکدوسرے سے اختلاف تھا۔ راجہ علی خاں اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ شہزادہ کا رویّہ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ فوج کے اندر رشوت خوری عام تھی۔ دشمن کو خبریں پہنچانے کے لیے پیسہ لیتے تھے۔

چاند بی بی کے کیمپ میں بھی حالات کچھ زیادہ بہتر نہ تھے۔ لیکن چاند بی بی اپنے خلوص اور اپنی مقناطیسی شخصیت سے کسی حد تک نظم وضبط پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس وقت چاند بی بی کی عمر پچاس برس تھی۔ جب وہ بیجاپور سے احمد نگر

کے لیے روانہ ہوئی۔ اس نے بہادر کو رہا کرنے کے لیے کہا مگر جیلر نے منع کر دیا۔ تاہم اس نے غائبانہ طور پر اس کے نام سے اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور خود فوجوں کی کمان سنبھال لی۔ وہ ایک سنجیدہ پُروقار اور غیر معمولی ہمت والی عورت تھی۔ بڑی ہوشیاری سے اس نے قلعہ کے تمام اندرونی اختلافات کو دور کر دیا۔ اس نے ابراہیم عادل شاہ اور قلی قطب شاہ کو امداد کے لیے خطوط لکھے۔ اخلاص خاں حبشی اور ابھنگ خاں کے پاس اپنے قابل اعتماد سفیر روانہ کیے۔ اس نے کہا کہ مادر وطن خطرہ میں ہے اور اس کی حفاظت کے لیے تمام دکنی اپنے اختلافات بھول کر ایک غیر ملکی طاقت کے خلاف متحد ہو جائیں۔ اس نے حب الوطنی کے جذبات کو للکارا۔ آخر کار مغل غیر ملکی تھے۔ اس لیے زیادہ تر دکنی امرا اور سلاطین چاند بی بی کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ گولکنڈہ اور بیجاپور بھی مغلوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

اسی دوران مغل فوجوں نے احمد نگر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ مغلوں کے ساتھ اس کے بعد چاند بی بی نے جو کارنامے دکھاتے وہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ مغل فوجوں نے قلعہ کے چاروں طرف بارود کی سُرنگیں بچھا دی تھیں۔ چاند بی بی نے انھیں پانی میں ڈبو کر بیکار کر دیا۔ اس کے باوجود ایک خشک سرنگ باقی رہ گئی تھی جو پھٹ گئی۔ اور جس سے قلعہ کی ایک دیوار مسمار ہو گئی۔ مغل فوجیں اس ٹوٹی دیوار سے قلعہ کے اندر داخل ہونے کا منصوبہ بنا رہی تھیں۔ مگر چاند بی بی کی مستعدی اور ہوشیاری سے وہ اپنے منصوبوں میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ چاند بی بی نے راتوں رات دیوار کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ پوری فوج اس کی تعمیر میں لگا دی اور خود دیوار پر بیٹھی سپاہیوں کا حوصلہ بڑھاتی رہی یہ دیوار پچاس گز لمبی اور تین گز چوڑی تھی۔ جو کچھ ہاتھ لگا اس دیوار میں بھر دیا گیا۔ یہاں تک کہ سپاہیوں کی لاشوں کو بھی دیوار میں چُن دیا گیا۔ ایک ہی رات میں دیوار بن کر تیار ہو گئی۔ صبح کو مغلوں نے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ مغل اس ٹوٹے راستہ سے اندر گھس جاتے مگر انھیں ڈر تھا کہ ایک سرنگ ابھی پھٹی نہیں تھی۔ انھیں اس کے پھٹنے کا بھی ڈر تھا۔ چاند بی بی کو مغل افسروں کی باہمی رقابتوں کا بھی علم تھا۔ اس نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا۔ انھیں توڑنے کے لیے ان کے پاس رشوتیں بھجوائیں۔

وہ مغلوں کے کیمپ پر توپوں کے ذریعہ اشرفیوں کی بارش کرتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی ذاتی ہمت اور حوصلہ نے بھی مدد کی اور سپاہیوں کے حوصلہ کو بناتے رکھا۔ زرہ بکتر پہنے۔ چہرہ پر نقاب ڈالے اور ہاتھ میں برہنہ شمشیر لیے وہ خونخوار شیرنی کی طرح گھومتی تھی اور اپنے مرحوم شوہر کے نعروں کو بلند کرتی تھی۔ اس کی سبز رنگ کی وردی ہر جگہ سے سپاہیوں کو نظر آتی تھی۔ اگلے پورے دن وہ نہایت بہادری سے لڑی۔ اس کے سپاہیوں نے مغلوں کے ہر حملہ کو ناکام بنا دیا اور گجرات سے آنے والی رسد کو بھی روک دیا جس سے مغل کیمپ میں کھانے کی زبردست قلت ہوگئی۔ دوسری طرف خانخاناں اور شہزادہ مراد میں ایکدوسرے سے سبقت لیجانے کے جنون میں آپس میں سخت اختلافات ہوگئے۔ اگرچہ خانخاناں کی کوشش تھی کہ جھگڑا نہ بڑھے۔ اسی لیے اس نے راجہ علی خاں کی بیٹی کی شادی شہزادہ کے ساتھ کرائی تھی کہ رشتہ داری سے تعلقات میں نرم گوشے پیدا ہوں گے۔ خانخاناں سپہ سالار تھا اسے فیصلے لینے ہوتے تھے۔ اس کو اپنے اختیارات کا استعمال بھی کرنا پڑتا تھا۔ شہزادہ سمجھتا تھا کہ مجھ پر بالادستی جتانا چاہتا ہے۔ دراصل شہزادے کے مصاحبین خانخاناں کے خلاف اس کے کان بھرتے رہتے تھے۔ ان میں صادق خاں پیش پیش تھا۔ وہ کہتا تھا خانخاناں احمدنگر کی جنگ اپنے نام لکھنا چاہتا ہے۔

چنانچہ مغلوں کو چاند بی بی سے صلح کرنی پڑی۔ صلح کیا تھی مغلوں کی شکست تھی۔ مغل دربار میں اس صلح کو ناپسندیدگی سے دیکھا گیا۔ ابوالفضل نے لکھا یہ صلح مغلوں کے شایان شان نہیں تھی۔ صلح کی شرطیں یہ تھیں ــــــ ۱۔ بہادر کو احمدنگر کا سلطان تسلیم کرلیا جائے اور وہ مغل سلطنت کے تحت کام کرے گا۔ ۲۔ برار کا صوبہ مغلوں کو دیدیا گیا۔ ۳۔ خطبہ اور سکہ مغل بادشاہ کے نام کا ہوگا۔ ۴۔ ہاتھی اور ہیرے جواہرات بادشاہ کو خراج کے طور پر بھیجے جائیں گے۔

بظاہر یہ شرطیں مغلوں کے حق میں تھیں مگر مغل مکمل تسلط سے کم پر رضامند نہیں تھے۔ دوسری طرف دکن میں علاقائی عناصر مغلوں کی موجودگی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ چاروں طرف پھر سے بغاوتیں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ دونوں جانب شک وشبہ کی فضا قائم تھی۔ ہر دو فریقین معاہدہ کی خلاف ورزی کا

ایکدوسرے پر الزام لگاتے تھے۔ برار پر مغلوں کا قبضہ دکنیوں کو کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ چنانچہ دکنیوں نے پھر سے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور وہ ایکبار پھر چاند بی بی کی قیادت میں مجتمع ہونے لگے۔ جب دکنیوں کی صف بندی کی خبر خانخاناں کو ملی وہ اس وقت جالنا میں تھا۔ اس نے بھی اپنی فوجوں کو جمع کیا اور شاہ پور پہنچا جہاں شہزادہ مراد قیام پذیر تھا۔ شاہ پور شہر شہزادہ کا ہی بسایا ہوا تھا اور وہ اکثر وہیں رہتا تھا۔ خانخاناں نے اس سے جنگ کے لیے کہا مگر شہزادہ نے انکار کر دیا اور اس بار خانخاناں نے تن تنہا لڑنے کا فیصلہ کیا۔ خانخاناں کا دوست خاندیش کا راجہ علی خاں، امبر کا جگناتھ اور دوسرے ہندو راجے اس کے ساتھ تھے۔ اس نے اشتی کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ اس مرتبہ دکنیوں کی کمان سہیل خاں کے ہاتھ میں تھی۔

اشتی کی جنگ ایک تاریخی جنگ تھی۔ اس جنگ میں خانخاناں کو اپنی پوری صلاحیتوں کے مظاہرہ کا موقع ملا۔ اس جنگ کا فیصلہ مغلوں کے حق میں ہوا جس کا تمام تر کریڈٹ خانخاناں کو حاصل ہوا۔ مغلوں کے پاس بیک وقت کبھی ۱۵ ہزار فوج سے زیادہ نہ رہی جبکہ دکنی اتحادیوں کے پاس ساٹھ ہزار فوج تھی۔ اس کے باوجود بھی فتح مغلوں کی رہی۔ ان کے پیچھے ان کی اقبال مندی کا دخل زیادہ تھا۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں مغل ہمیشہ کم فوج سے بڑی فوج پر فتح حاصل کرتے آتے تھے۔ اس جنگ میں توپوں کا استعمال بھی خوب ہوا جو دکنیوں نے پرتگالیوں سے حاصل کی تھیں۔ مغلوں کی بارودی طاقت بھی زیادہ تھی۔ اس جنگ میں خانخاناں کا دوست اور ایک نہایت جری انسان راجہ علی خاں مارا گیا۔ رام چند بھی کام آیا۔ راجہ علی خاں کے ہاتھ میں ہراول دستہ کی کمان تھی۔ راجہ کو وہاں نہ دیکھکر اوّلاً دکنیوں نے خیال کیا کہ خانخاناں مارا گیا اور راجہ علی خاں کے بارے میں مشہور ہوا کہ وہ میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ لیکن جنگ کے بعد اس کی لاش عین میدان جنگ میں لاشوں کے نیچے دبی پائی گئی۔ اس کی موت بھی ایک عجیب اتفاق تھی۔ خانخاناں کو ایک جاسوس نے اطلاع دی کہ سہیل خاں کا توپ خانہ بالکل تمہارے سامنے ہے اور وہ کسی وقت بھی فائر کر سکتا ہے۔ چنانچہ خانخاناں وہاں سے ہٹ گیا اور راجا نے میں راجہ علی خاں خالی جگہ دیکھ کر وہاں آگیا اور موت کا شکار ہو گیا۔ رات کا وقت

تھا۔ وہ صحیح صورت حال کا اندازہ بھی نہیں لگا سکا۔

خانخاناں کی فوج میں دولت خاں لودی جیسے بہادر جنگجو بھی تھے جو موت سے نہیں ڈرتے تھے۔ جنگ کے ایک مرحلہ پر خانخاناں اور دولت خاں دونوں ساتھ تھے اور کل چھ سو گھوڑ سواران کی پشت پناہی پر تھے۔ دیکھا کہ دکنیوں کا توپ خانہ آگے بڑھا چلا آتا ہے۔ دولت خاں نے کہا "اجازت ہو تو قلب پر حملہ کر دوں؟" خانخاناں نے مسکرا کر جواب دیا۔ " دلّی کا نام بدنام کرے گا۔" دولت خاں کا جواب تھا۔ اگر دشمن کے پاؤں اکھاڑ دیے تو سو دتی بنالیں گے اور اگر مارے گئے تو معاملہ خدا کے سپرد ہے۔"

اس جنگ میں سادات بارہہ کی ایک جمعیت بھی شریک تھی جس کی کمان قاسم بارہہ کے ہاتھ میں تھی۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کے استحکام میں سادات بارہہ کا اہم رول ہے۔ بہت سی جنگوں کی کامرانی کا سہرا ان کے سر ہے[۱]۔ دولت خاں لودی نے قاسم بارہہ سے بھی پوچھا کہ کیا راتے ہے۔ آگے بڑھیں کہ پیچھے لوٹ جائیں۔ قاسم نے جواب دیا" ہم تو ہندوستانی ہیں۔ مرجانے کے سوا کوئی چارہ نہیں، ہاں البتہ خانخاناں سے پوچھ لو کہ اس کا کیا ارادہ ہے۔" دولت خاں، خانخاناں کی طرف مڑا اور اس سے مخاطب ہوا۔" اتنا بڑا لشکر سامنے ہے۔ یوں تو فتح و شکست قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ بظاہر کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے۔ اگر شکست ہوئی تو اپنی جگہ بتادو جہاں آپ کو ڈھونڈلیں۔" خانخاناں کا جواب تھا" لاشوں کے نیچے۔" یہاں ہر شخص کشتیاں چلا کر لڑنے آیا تھا۔ یہی انفرادی ہمت وجرأت مغلوں کا طرۂ امتیاز تھی جس نے انھیں جتایا۔

جنگ کے آخری مرحلہ میں دکنیوں کے سپہ سالار سہیل خاں حبشی کو ایک تیر آکر لگا اور وہ زخمی ہو کر گھوڑے سے نیچے گر پڑا۔ دکنیوں نے راہ فرار اختیار کی مغلوں

---

[۱] سادات بارہہ۔ بارہ گاؤں انہیں ضلع مظفر نگر میں دیدیے گئے تھے۔ اسی لیے بارہہ کہلاتے تھے۔ مذہبی جوش اور سپاہیانہ شجاعت، جنگ میں آگے آگے رہنا ان کی خصوصیات تھیں۔ یہ لوگ مذہباً شیعہ تھے۔

نے کامرانی کا ڈنکا بیٹ دیا۔ خانخاناں کو ۱۵۹۶ء میں یہ فتح حاصل ہوئی۔ اسی سال اس کا جواں سال بیٹا حیدر قلی اس دنیا سے رخصت ہوا۔ خانخاناں اسے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ شراب کی لت میں مبتلا تھا۔ وہ نشہ کی حالت میں تھا کہ بستر میں آگ لگ گئی اور وہ اسی میں جلکر مرگیا اور اسی سال انبالہ کے مقام پر خانخاناں کی بیوی ماہ بانو کا بھی انتقال ہو گیا۔

خانخاناں اور شہزادہ مراد کے درمیان تعلقات برابر کشیدہ تھے۔ اگرچہ خانخاناں نے دکن کی بیشتر جاگیریں شہزادہ کو دیدی تھیں اور وہ شاہ پور شہزادہ کے پاس بھی جاکر رہا۔ لیکن شہزادہ کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مراد نے بادشاہ کو شکایت کا خط لکھا۔ خانخاناں نے بھی صورت حال سے مطلع کیا۔ اور لکھا کہ وہ واپس آرہا ہے۔ بادشاہ نے خواص روپ سنگھ کو خانخاناں کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ خانخاناں دکن کی جانب پھر کوچ کرے۔ خانخاناں نے بادشاہ کے حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا جب تک شہزادہ دکن میں ہے وہ دکن میں نہیں رہے گا۔ اُدھر شہزادہ برابر بادشاہ کو شکایتیں لکھ لکھ کر بھیج رہا تھا۔ آخر کار بادشاہ خانخاناں سے ناراض ہو گیا۔ لیکن بعد میں جب خانخاناں دربار میں حاضر ہوا اور اس نے بادشاہ کے سامنے تمام حقائق رکھے تو بادشاہ کی غلط فہمی دور ہوئی اور خانخانان کو پھر سے بادشاہ کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔

اُدھر مراد اور اس کی فوج کا بُرا حال تھا۔ شہزادہ شراب کا عادی تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی صحت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ فوج میں لاقانونیت پھیلی ہوئی تھی۔ اسے مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ بادشاہ تک جب یہ خبریں پہنچیں تو اس نے ابوالفضل اور سید یوسف مشہدی کو شہزادہ کو واپس لانے کے لیے دکن بھیجا۔ شہزادہ کا یہ حال تھا کہ منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ وہ ابوالفضل یا بادشاہ کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دکن میں اپنی ناکامی کی شرمندگی تھی پھر شراب نے بُرا حال کر دیا تھا۔ تلنگانہ میں ایک مقام تھومی کے مقام پر شہزادہ خیمہ زن تھا ابوالفضل بھی وہاں پہنچ گیا مگر افسوس جس روز وہ وہاں پہنچا اسی روز شہزادہ کا انتقال ہو گیا۔ شہزادہ کے کیمپ میں مطلق العنانی پھیلی تھی۔ ابوالفضل نے تین سو سپاہیوں کے دستہ کی

مدد سے جو اس کے ہمراہ تھا کسی حد تک نظم وضبط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ شہزادہ کا انتقال ۱۲ مئی ۱۵۹۹ء میں ہوا۔ اس وقت اس کی عمر صرف تیس سال تھی۔ دکن کی مہم کا پہلا مرحلہ ختم ہوتا ہے۔

II۔ دوسرا مرحلہ

شہزادہ مراد کے انتقال کے بعد بادشاہ اکبر نے اس بار اپنے سب سے چھوٹے بیٹے دانیال کو دکن بھیجنے کا فیصلہ کیا اور اس کا سپہ سالار عبدالرحیم خانخاناں کو مقرر کیا۔ اس مرتبہ زیادہ تیاریاں کی گئیں۔ سابقہ غلطیوں کی روشنی میں نئے اقدامات اٹھائے گئے۔ خانخاناں کی بیٹی جانا (جانان) بیگم سے شہزادہ کی شادی کردی گئی تاکہ دونوں دو قالب ایک جان ہو کر لڑیں اور سابقہ تلخ تجربہ کو نہ دہرائیں۔

اسی دوران ابوالفضل نے رپورٹ بھیجی کہ خاندیش کا حکمراں بہادر خاں فاروقی جو راجہ علی خاں کا جانشین تھا مغل دربار سے سرتابی کرتا ہے اور اس کی سرکوبی ضروری ہے۔ ابوالفضل نے بادشاہ سے ذاتی طور پر مداخلت کی درخواست کی۔ خاندیش میں قلعہ اسیر ناقابل تسخیر قلعہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ فاروقی نے اس قلعہ میں پناہ لے رکھی تھی۔ بادشاہ نے خانخاناں اور دانیال کو احمد نگر کے لیے روانہ کیا اور خود اسیر گڑھ پر چڑھائی کی۔ خانخاناں نے اس موقع پر دکن کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے بادشاہ کو بہت سے قیمتی تحفے پیش کیے جن میں ایک گھوڑا بھی تھا۔ گھوڑا کیا تھا ایک عجوبہ تھا۔ ہاتھی سے کشتی لڑتا تھا۔ سامنے سے حملہ آور ہوتا تھا۔ پچھلے پاؤں سے حملہ کرتا تھا۔ دو پاؤں پر کھڑا ہو کر اگلے پاؤں ہاتھی کے سر پر رکھ دیتا تھا۔

اکبر بادشاہ خاندیش کے دارالخلافہ برہان پور میں خیمہ زن ہوگیا۔ خانخاناں اور دانیال احمد نگر کی جانب بڑھے۔ اس مرتبہ دکنیوں کی کمان ابھنگ خاں کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے اپنے کو قلعہ میں محصور کرلیا۔ چاند بی بی اب پہلی سی چاند بی بی نہ تھی۔ وہ مغلوں سے لڑائی کے موڈ میں نہیں تھی۔ ابھنگ نے اس سے مدد کی درخواست کی مگر اس نے انکار کر دیا۔ دکنیوں نے فوجی مجلس میں مشورہ کیا۔ چاند بی بی سے بھی مشورہ طلب کیا گیا۔ اس نے لڑنے کے بجائے صلح کرنے کے لیے کہا اس پر

لوگ ناراض ہو گئے ۔ خاص طور پر چتیہ خاں کو اس کا مشورہ بہت ناگوار گزرا۔ اور اس نے فوجوں میں یہ افواہ پھیلا دی کہ چاند بی بی نے مغلوں سے ساز باز کر رکھی ہے۔ کہا جاتا ہے اس نے باقاعدہ مغلوں کے ساتھ صلح کی مہم چلا دی تھی ۔ چنانچہ عقل و فہم کی بات کرنے والوں کا جو انجام ہوتا ہے ۔ چاند بی بی کا بھی وہی انجام ہوا۔ اسے قتل کر دیا گیا۔

خانخاناں احمد نگر قلعہ کا محاصرہ کیے پڑا رہا۔ اس بار مغلوں کے پاس بھاری توپ خانہ تھا۔ جس کی مدد سے مغلوں نے قلعہ کی ایک دیوار کو منہدم کر دیا۔ قلعہ کے اس حصہ کا نام لیلیٰ تھا۔ اس جنگ میں خانخاناں کے ساتھ ہندو راجاؤں جیسے راجہ جگناتھ نے بڑی دلچسپی دکھائی ۔ قلعہ کے چاروں طرف سرنگیں بھی بچھائی گئیں۔ ایک شخص یحییٰ خاں دیوار سے چڑھ کر قلعہ کے برج بلبلی یا بابلی میں پہنچا جہاں اس نے دروازہ کھول دیا اور مغل فوج قلعہ کے اندر داخل ہو گئی ۔ کئی سو دکنی لڑائی میں مارے گئے۔ آخر کار چار ماہ چار دن کے محاصرہ کے بعد قلعہ فتح ہو گیا ۔ بیش بہا خزانہ ہاتھ لگا۔ نظام الدین بہادر شاہ کے نام سے ایک لڑکا احمد نگر کا سلطان تھا جسے گرفتار کر لیا گیا اور خانخاناں خود اسے لیکر بُرہان پور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا جہاں اسے قلعہ گوالیار میں قید کر دیا گیا۔ بہت سا اسلحہ مغلوں کے قبضہ میں آگیا۔ بیس ہاتھی، قیمتی زیورات اور کپڑے بھی مالِ غنیمت میں ہاتھ آتے ۔ نایاب کتب و مخطوطات کی ایک لائبریری پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔

شہزادہ دانیال بھی برہان پور میں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسے خاندیش اور برار کا گورنر مقرر کیا گیا ۔ ابوالفضل کو اسیر گڑھ دیا گیا۔ مگر ابوالفضل کو خانخاناں کے ماتحت کر دیا گیا ۔ افسری و ماتحتی کے تعلق سے جو کبھی دوست تھے ایکدوسرے کے دشمن بن گئے ۔ خانخاناں، ابوالفضل کے خلاف ہو گیا اور اس نے اس کے خلاف بادشاہ کو سخت خطوط لکھے۔

احمد نگر اور اسیر گڑھ کی فتح کے بعد بادشاہ آگرہ واپس لوٹ آیا چونکہ شہزادہ سلیم کی سرکشی کی خبریں اسے پریشان کر رہی تھیں۔

اکبر کے دلّی واپس لوٹ جانے کے بعد دکن میں صورت حال بدل گئی ۔ اب

میاں راجو دکنی اور ملک عنبر دکن میں جنگ آزادی کی قیادت کر رہے تھے۔ میاں راجو ایک مسلمان سید زادہ تھا جبکہ ملک عنبر ایک حبشی تھا۔ اس کا ایک نام بازجیو بھی تھا۔ اصل نام شمبھو تھا۔ دونوں نہایت بہادر اور جنگجو تھے۔ انھوں نے دکن کو آپس میں تقسیم کرلیا تھا۔ میاں راجو کے پاس دولت آباد اور گجرات کی سرحد تک علاقہ تھا۔ جبکہ گولکنڈہ اور بیجاپور اور احمد نگر تک کا علاقہ ملک عنبر کے قبضہ میں تھا۔ احمد نگر کے تخت پر مرتضیٰ نظام شاہ ثانی بیٹھا تھا اور یہ دونوں مہم جو، اس کے ماتحت تھے دونوں آپس میں لڑتے بھی رہتے تھے۔ یہ ایک الگ کہانی ہے جس کا ہمارے موضوع سے تعلق نہیں۔

بادشاہ نے اس مرتبہ دکن کی مہم کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک فوج کا سپہ سالار ابوالفضل کو مقرر کیا تھا جو میاں راجو کے خلاف بھیجا گیا اور احمد نگر جس کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ عبدالرحیم خانخاناں برار اور تلنگانہ میں مقرر ہوا جس کا مقصد ملک عنبر کے خلاف لڑنا تھا۔ اس معرکہ میں خانخاناں کے بیٹے مرزا ایرج نے بھی حصہ لیا اور پانچ ہزار کی فوجوں کی مدد سے ملک عنبر کو ہرادیا۔ اس کے ساتھ جنگ میں ملک عنبر سخت زخمی ہوا اور اس کے سپاہی اسے میدان جنگ سے اٹھاکر لے گئے۔ بیس ہاتھی مرزا ایرج کو مال غنیمت میں ملے۔

ملک عنبر کے جب زخم بھر گئے تو اس نے پھر سے جنگ کی تیاری شروع کی مگر اب وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ مغلوں سے ٹکرّ لینا آسان کام نہیں۔ اس لیے اس نے صلح کرنے میں عافیت سمجھی۔ اس بارے میں اس نے خانخاناں کو تجویز بھیجی۔ خانخاناں نے اس کی تجویز کو منظور کرلیا اور اس کا علاقہ اسے واپس لوٹا دیا۔ اس معاہدہ کے بعد سے وہ دونوں دوست بن گئے اور خانخاناں ایک دوست کی طرح ملک عنبر کی مدد کرتا رہا۔ ملک عنبر سے دوستی کی وجہ سے خانخاناں پر الزام تھا کہ وہ دکنیوں سے ملا ہوا ہے۔

دکن میں مغلوں کے بڑھتے اثرات کو دیکھ کر دو چھوٹی ریاستیں گولکنڈہ اور بیجاپور بھی خوفزدہ ہوگئیں اور مغلوں سے صلح کرنا چاہتی تھیں۔ بادشاہ کو پیغامات بھیجے گئے کہ شہزادہ دانیال جو کہ دکن کا صوبیدار بھی تھا کی شادی بیجاپور کے سلطان

ابراہیم عادل شاہ کی بیٹی سے کر دی جاتے۔ بادشاہ نے یہ رشتہ منظور کر لیا۔ دریائے گوداوری کے کنارے ایک قصبہ پیتھان کے مقام پر بڑی دھوم دھام سے شادی ہوگئی بظاہر اب دکنی سلطانوں سے مغلوں کے تعلقات خوشگوار ہو گئے تھے مگر پھر بھی راجو جیسی طاقتیں سر ابھارتی تھیں جن کے خلاف مہم آرائی کرنی پڑتی تھی۔ ملک عنبر کے خلاف راجو برابر محاذ آرائی کرتا رہتا تھا۔ ان دونوں کی لڑائی میں خانخاناں نے ملک عنبر کی مدد کی اور وہ خانخاناں کی مدد کی وجہ سے کامیاب ہوتا تھا۔ جالنا کے مقام پر خانخاناں کی چھاؤنی تھی جہاں سے وہ پورے دکن کو کنٹرول کرتا تھا۔ پورا تلنگانہ اور دکن کا بیشتر حصہ خانخاناں کی کوششوں سے مغل سلطنت کے ماتحت آگیا۔

دکن میں دانیال کا بھی وہی انجام ہوا جو مراد کا ہوا تھا۔ دراصل وہ بھی برائے نام ہی صوبیدار تھا۔ سب کچھ تو خانخاناں کو ہی کرنا ہوتا تھا۔ دانیال نے بھی مغل روایت کا پاس رکھا۔ وہ بھی بلا کا شراب نوش تھا۔ بادشاہ کو شہزادہ کی شراب نوشی کی اطلاع پہنچتی رہتی تھی اور وہ جس کی وجہ سے فکرمند رہتا تھا۔ وہ اکثر خانخاناں کو لکھتا کہ شہزادہ کو سمجھاتے۔ خاص طور پر لوگوں کو مقرر کیا ہوا تھا کہ وہ شہزادہ کو شراب نوشی سے روکیں۔ مگر وہ بہانہ بنا کر جنگلوں میں نکل جاتا اور چوری سے شراب پیتا۔ بندوق کی نالیوں، بکرے کی کھال اور پگڑیوں میں چھپا چھپا کر شراب اس کے لیے فراہم کی جاتی۔ آخر ایکدفعہ وہ زیادہ شراب پینے سے ہی بیمار پڑ گیا اور چالیس دن تک بیہوش رہا اور اسی حالت میں ۲۰ اپریل ۱۶۰۴ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی بیگم جاناں بیگم اور رحیم کی بیٹی جوانی میں بیوہ ہو گئی۔ وہ اس غم میں خودکشی کر لینا چاہتی تھی، مگر اسے باز رکھا گیا۔ موت کے وقت دانیال کی عمر ۳۳ سال اور ۶ ماہ تھی۔[1]

---

[1] مغلوں میں شراب کا عام رواج تھا۔ بلکہ شراب نوشی ان کی قومی پالیسی کا حصہ تھی۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے جب وہ منگول تھے تو بیگن کہلاتے تھے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا اپنی قبائلی زندگی کی بہت سی عادتیں انھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ترک نہیں کی تھیں۔ ان میں شراب نوشی بھی ایک تھی۔ اوّلاً بادشاہ خود شہزادہ کو شراب نوشی کا سبق سکھاتا تھا۔ شہزادہ سلیم کو خود اکبر نے شراب کا پہلا جام پیش کیا اور باقاعدہ اس کا جشن بھی منایا۔ بابر نے (باقی اگلے صفحہ پر)

کیسا عبرتناک انجام تھا۔ دانیال کے بچپن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں کامیاب رہے گا۔ اسے مضبوط جسم اور تیز دماغ قدرت نے دیا تھا۔ خوبصورت ناک نقشہ تھا۔ پسندیدہ اطوار کا مالک تھا۔ بہت مجلسی آدمی تھا۔ اچھی گفتگو کرتا تھا۔ ورزش کرتا تھا۔ بہترین نشانہ باز تھا۔ گھوڑے کی سواری میں ماہر تھا۔ ہاتھیوں کا بھی شوق رکھتا تھا۔ برج بھاشا یا ہندی شاعری کا دلدادہ تھا۔ خود بھی ہندی میں شعر کہتا تھا۔ جانا بیگم سے اس کی شادی اسی لیے کی گئی تھی کہ وہ کسی طرح شراب ترک کر دے شاید بیوی بھی اس کی عادت چھڑوانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

عہد اکبری میں خانخاناں کی زندگی کا یہ باب ختم ہوتا ہے۔ نئی بساط بچھتی ہے۔ اکبر کی موت کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوتا ہے اور ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

❋

پچھلے صفحہ کا بقیہ:

بڑے فخر سے شراب نوشی کی ان پارٹیوں کا ذکر کیا ہے جو بقول اس کے افکار و آلام کو ڈبو دیتی ہیں۔ ہمایوں نے شراب اور افیون سے اپنی صحت برباد کی۔ اس کے ایک لڑکے محمد حکیم نے صرف ۳۱ سال کی عمر میں شراب نوشی کی لت میں جان دی۔ اکبر گو سب سے کم شراب پیتا تھا مگر بعض اوقات وہ بھی کثرت سے پیتا تھا۔ جہانگیر تزک میں لکھتا ہے کہ "میں شراب کا عادی نہیں تھا۔ ایک بار ایک ملازم نے شکار سے واپسی پر تھکن اتارنے کے لیے ایک جام پیش کیا۔ اس کے بعد مجھے عادت ہو گئی۔ جب شراب انگوری سے تسلی نہیں ہوتی تو اسپرٹ پینے لگا۔ بیس جام روز پیتا تھا۔ چودہ جام دن میں باقی رات میں۔ اس کا وزن ہندوستانی ۶ سیر اور ایرانی ایک مَن ہوتا ہے۔ میری خوراک روٹی اور سبزی کے ساتھ ایک مرغ تھی۔ نشہ کی حالت میں مَیں جام اپنے ہاتھوں سے نہیں تھام سکتا تھا۔ دوسرے لوگ مجھے پلاتے تھے"۔ کشمیر کے سفر میں نورجہاں، آصف خاں، شہریار، داور بخش اور دوسرے امرا اس کے ہمراہ تھے۔ بادشاہ کو دمہ کی شکایت تھی اور دن بدن وہ کمزور ہوتا جاتا تھا۔ اس کی بھوک بالکل جاتی رہی۔ حتیٰ کہ افیون بھی اب کچھ کام نہ کرتی تھی۔ وہ انگوری شراب کے چند پیالوں کے سہارے زندہ تھا۔ آخری وقت میں بھی اس نے شراب کا جام مانگا جو اس کے منہ سے لگا دیا گیا۔ مگر وہ اسے پی نہ سکا اور انتقال ہو گیا۔

۷

جہانگیر اور خانخاناں

خانخاناں دولت آباد میں مقیم تھا کہ ۲۶ راکتوبر ۱۶۰۵ء کی درمیانی شب میں اکبر کی موت کی خبر پہنچی۔ خانخاناں نے سب کام بند کر کے تعزیتی جلسہ بلایا۔ اور سیاہ لباس پہن کر اس میں شریک ہوا۔ تعزیتی تجویز پاس کی گئی اور جہانگیر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ خانخاناں نے اپنے وکیل دولت خاں لودی کو بہت سے قیمتی تحائف جن کی قیمت ڈیڑھ لاکھ تھی اور نئے بادشاہ کے تئیں حلف وفاداری کے ساتھ دربار میں بھیجا۔ تحائف میں دکن میں بنے قیمتی کپڑے بھی شامل تھے۔ بادشاہ نے دکن کی صوبیداری خانخاناں کے نام رہنے دی اور اس کی توثیق کر دی۔ ساتھ ہی ایک جڑاؤ تلوار اور ایک عراقی گھوڑا تحفہ میں بھیجا۔

۱۶۰۷ء میں خانخاناں کو دربار میں طلب کیا گیا کیونکہ تخت نشینی کے بعد اس کی حاضری نہیں ہوئی تھی۔ دربار میں اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ خانخاناں نے بادشاہ کی خدمت میں قیمتی تحائف پیش کیے۔ جہانگیر نے تزک میں خانخاناں سے ملاقات کا حال اس طرح لکھا ہے: "وہ خوشی اور مسرت سے بے قابو ہو رہا تھا۔ جیسے پاؤں سے نہیں سر کے بل چلکر آیا تھا۔ نہایت بے خودی کے عالم میں اس نے اپنا سر میرے قدموں میں رکھدیا۔ نہایت محبت اور پیار کے ساتھ میں نے اسے زمین پر سے اٹھایا اور گلے لگایا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس نے تحفہ کے طور پر موتیوں کی دو تسبیحیں کچھ مونگے اور ہیرے جواہرات جن کی قیمت تین لاکھ ہو گی، دوسری مختلف چیزوں کے ساتھ

پیش کیے ؎۱،،

بادشاہ نے خانخاناں کے مراتب میں اضافہ کیا اور شاہ عباس صفوی والئ ایران کا بھیجا ہوا گھوڑا اور بہت سے ہاتھی انعام میں دیے۔

؎۱ اس اقتباس سے جہانگیر اور خانخاناں کے باہمی تعلق پر روشنی پڑتی ہے۔ خانخاناں جہانگیر کا اتالیق رہ چکا تھا۔ وہ بچپن میں دونوں ساتھ کھیلتے تھے۔ مگر مغلوں کے یہاں خونی یا اخلاقی رشتے کوئی معنی نہ رکھتے تھے۔ خانخاناں کے ساتھ بھی اس کے تعلقات خوشگوار نہ رہ سکے۔ شہزادہ کی حیثیت سے جہانگیر کا بچپن عیاشی اور شراب نوشی میں گزرا۔ وہ ایذا پسند شہزادہ تھا۔ اگرچہ اس کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی۔ مگر اس کی سیرت پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔

جہانگیر بڑی آرزوؤں اور منتوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اکبر اس زمانہ کے بزرگ صوفی شیخ سلیم چشتیؒ کے پاس حاضر ہو کر ان سے دعا کی درخواست کرتا کہ مغل سلطنت کو ایک ولیعہد نصیب ہو۔ بڑی دعاؤں کے بعد جب سلیم پیدا ہوا تو اکبر پا پیادہ اجمیر خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر پہنچا جس کی اس نے منت مانی تھی۔ آگرہ سے اجمیر تک ۲۲۸ میل کا یہ فاصلہ اس نے پیدل طے کیا جو صوفیوں کے تئیں اس کے عقیدہ و محبت کی دلیل ہے اور اس بات کا ثبوت بھی کہ وہ بیٹے سے کس درجہ محبت کرتا تھا۔

جب ماں کو ذرا سی بھی تکلیف ہوتی، اکبر پریشان ہو جاتا چونکہ پیٹ میں سلطنت کا ولیعہد پل رہا تھا۔ رانی، جہانگیر کی ماں، جو راجپوتانی تھی آگرہ سے فتحپور سیکری منتقل کر دی گئی تاکہ شیخ سلیمؒ کی قربت رہے اور اس لیے بھی کہ آگرہ شہر "منحوس،، قرار دیدیا گیا تھا۔ ایکدفعہ وہ چیتہ کے شکار کے لیے گیا تھا کہ ماں کے پیٹ میں بچّہ کی حرکت بند ہو گئی، بادشاہ کی نیند حرام ہو گئی۔ عہد کیا کہ چیتہ کا شکار نہیں کھیلے گا۔ اپنے زمانہ کے بہترین عالموں نے اسے تعلیم دی تھی۔ شرفا کی بیگمات نے انّا کے فرائض انجام دیے تھے۔ ایسے نازونعم میں پلا بیٹا ناخلف اور ناکارہ ثابت ہو جاتے تو باپ کے دل پر کیا گزرے گی۔ شہزادگی کا سارا زمانہ باپ کے خلاف بغاوتوں میں گزرا۔ خود باپ کو آنکھیں دکھاتا تھا۔ طرح طرح سے باپ کی دلآزاری کرتا تھا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

دکن میں حالات خراب تھے۔ ملک عنبر کو اپنے کو منظم کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے سلطان مرتضیٰ دوم کو قید کر لیا اور اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ جہانگیر

پچھلے صفحہ کا بقیہ:

لیکن قسمت کا دھنی تھا کہ تاج شاہی سر پر رکھا گیا۔ دو بھائی (مراد اور دانیال) جو تخت کے امیدوار ہو سکتے تھے پہلے ہی ملک عدم کو رخصت ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ بادشاہ اپنی زندگی ہی میں اس کی ولیعہدی کا اعلان کر گیا تھا۔ حالات نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ بہت سے علما اکبر کی غیر اسلامی پالیسیوں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ انھوں نے جہانگیر کی مدد کی کہ وہ اسلامی شریعت کو نافذ کرے گا۔ اکبر کے دربار کے ایک ممتاز امیر شیخ فرید بخاری تھے جو اپنی غیر جانب داری، جرات اظہار اور داد و دہش کی وجہ سے دربار میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ جہانگیر کو بادشاہ بنانے میں ان کا نمایاں رول تھا۔ بادشاہ ابھی بستر مرگ پر تھا۔ زبان بند ہو چکی تھی۔ شیخ فرید، شہزادہ کو بادشاہ کے قریب لے گیا اور خادموں سے کہا کہ بادشاہ کی پگڑی جہانگیر کے سر پر رکھ دیں۔ یہ اعلان تھا اس کی بادشاہت کا۔ شیخ فرید کے سامنے کسی دوسرے کو مخالفت کی ہمت نہ ہو سکی۔

اگر چہ کچھ امرا جہانگیر کے بیٹے خسرو کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ اور وہ تھا بھی بادشاہت کے لائق۔ بہت سی باتوں میں وہ بادشاہ سے بہتر تھا۔ اس نے ابوالفضل اور ابوالخیر کے زیر سایہ تعلیم حاصل کی تھی۔ ہندی فلسفہ سیکھا تھا جس کا استاد شیو دت تھا۔ اس نے سنسکرت زبان بھی سیکھی تھی۔ سپاہی بھی بہت اچھا تھا۔ شراب اور عورت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ وجیہہ اور خوبرو تھا اور دربار میں مقبول بھی۔ اپنے دادا اکبر کی بہت سی خوبیاں اس میں نظر آتی تھیں۔ وہ شاید ایک کامیاب حکمراں ثابت ہوتا مگر ستارے جہانگیر کا ساتھ دے رہے تھے۔ پھر باپ کی موجودگی میں بیٹے کا بادشاہ بنانا تاتاریوں کی روایت کے خلاف تھا۔

اگر چہ جہانگیر کی شہزادگی کا زمانہ نہایت پراگندگی میں گزرا اور اسے راسخ العقیدہ طبقہ کی حمایت حاصل تھی مگر عنان حکومت سنبھالنے کے بعد وہ بالکل بدل گیا۔ وہ اکبر سے زیادہ وسیع النظر، سیکولر اور آزاد خیال ثابت ہوا۔ انصاف پسندی کو

باقی اگلے صفحہ پر

مرکز میں اپنے بیٹے خسرو کی سرکشیوں سے پریشان تھا۔ اس لیے دکن پر توجہ نہیں دے پا رہا تھا۔ ملک عنبر گوریلا طریقہ جنگ میں ماہر تھا اور اسے مراٹھوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس لیے اس نے بہت سے مقبوضہ علاقوں کو پھر سے آزاد کرا لیا تھا۔

جہانگیر نے ۱۶۰۸ء میں مان سنگھ کو شاہی فوجوں کا سپہ سالار مقرر کیا اور خانخاناں کو پھر دکن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ خانخاناں نے کہا کہ وہ دو سال میں دکن فتح کر کے دکھا دے گا اگر اسے مزید ۱۲ ہزار فوج اور دس لاکھ روپیہ مل جاتے۔ بادشاہ نے یہ شرطیں منظور کر لیں۔ مزید اسے خاندیش اور برار کی صوبیداری بھی دیدی اور آزادانہ کام کرنے کے لیے سیاسی اور مالی اختیارات بھی بڑھا دیے۔ مگر خانخاناں ملک عنبر کے مقابلہ میں دشواریاں محسوس کر رہا تھا۔ ملک عنبر کی فوجی طاقت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اس لیے خانخاناں نے مزید امداد کی درخواست کی۔ بادشاہ نے شہزادہ پرویز اور آصف خاں کو اس کا سرپرست مقرر کر کے دکن کے لیے مزید فوج بھیجی۔ اسی دوران انگریز سیاح ولیم ہاکنس سے خانخاناں کی ملاقات ہوئی۔

۱۶۰۹ء میں سیاح ولیم ہاکنس خانخاناں سے برہان پور کے مقام پر آملا۔ وہ سورت سے آگرہ ایک شکایت لے کر آیا تھا۔ ولیم ہاکنس کی شکایت تھی کہ سورت اور کیمبے میں نئے نئے پرتگالی آرہے تھے اور مقرب خاں اُن سے ملکر ولیم ہاکنس کو قتل کرانا چاہتا تھا۔ کہتے ہیں ولیم ہاکنس نے خانخاناں سے تین گھنٹے تک ملاقات کی اور خانخاناں نے اس کے اعزاز میں کھانے کا بھی انتظام کیا۔ دونوں میں ترکی زبان میں گفتگو ہوئی۔ رخصتی پر خانخاناں نے اسے خلعت

پچھلے صفحہ کا بقیہ:

اس نے اپنی حکومت کی اساس بنایا۔ وہ خود مذہبی نہ تھا لیکن سیاسی مصلحتوں کی بنا پر کٹر بنیاد پرست علما کی حمایت کرتا تھا۔ اس نے علما کے اس طبقہ کو خوش کرنے کے لیے مذہبی اختلاف کی بنا پر سزائیں بھی دیں۔ اس کی تمام تر فراخدلی اور آزاد خیال کے اس کے عہد میں اسلام کی احیا پرست طاقتوں کو فروغ حاصل ہوا۔ (مصنف)

سے نوازا اور بادشاہ کے نام سفارشی خط بھی لکھا۔ ترکی زبان جاننے کی وجہ سے ہاکنس کو بادشاہ اکثر گفتگو کے لیے بلاتا اور پرتگالیوں کے طرز زندگی کے بارے میں سوالات کرتا۔

اس مرتبہ دکن میں خانخاناں کو سخت مشکلات کا سامنا تھا۔ ملک عنبر اب پہلے والا عنبر نہیں تھا جس کی خانخاناں سے دوستی تھی۔ اب اس نے اپنی طاقت کو کئی گنا بڑھا لیا تھا۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے۔ ملک عنبر حبشی تھا مگر اس نے دکن کی وطنیت اختیار کر لی تھی اور احمد نگر کے طاقتور ترین امیر اور فاتح برار چنگیز خاں سے جنگی تربیت حاصل کی تھی۔ ملک عنبر نے اپنے آقا کی مثالی خدمت انجام دی اور وہ ہمیشہ اس کی صحبت میں رہتا تھا۔ اس کی ذہانت اور اخلاقی جرات نے بہت جلد اسے نظام شاہی حکمرانوں کی مجلس شوریٰ میں پہنچا دیا تھا۔ مغل دربار کے مورخین جو ملک عنبر کی دل کھول کر برائی کرتے ہیں وہ بھی ملک عنبر کی انتظامی صلاحیتوں اور شخصی خوبیوں کا اعتراف کرنے پر مجبور رہیں۔ جب احمد نگر دکنیوں کے ہاتھ سے نکل گیا (اب احمد نگر مغل امیر خواجہ بیگ مرزا صفوی جو والئ ایران شاہ طہماسپ صفوی کا رشتہ دار تھا زیر انتظام تھا)، تو ملک عنبر نے اپنا ہیڈ کوارٹر کھڑکی کے مقام کو بنا لیا تھا جسے فتح نگر بھی کہتے ہیں اور جو خود اس کا بنایا ہوا خوبصورت شہر تھا۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا اور جنگی نقطۂ نظر سے محفوظ تھا۔ اس نے نظام شاہی گھرانہ کے ایک لڑکے مرتضیٰ کو سلطان بنا کر خود کاروبار حکومت چلاتا تھا۔

ملک عنبر ایک لائق منتظم تھا۔ اس نے دکن میں ٹوڈرمل کا نظام مالگذاری نافذ کیا تھا۔ جس کے سبب کاشتکار خوشحال اور حکومت مالدار ہوگئی تھی۔ اسے دکن میں اپنی طاقت مجتمع کرنے اور اصلاحات نافذ کرنے کے لیے صرف چھ سال کی مدت ملی تھی۔ اس نے گاؤں پر بھی توجہ دی۔ مالگذاری جنس میں وصول کرنے کا تجربہ کیا۔ پھر نقد لینے لگا۔ عنبر کا سب سے بڑا کارنامہ اس کی جنگی حکمت عملی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ احمد نگر اپنے محدود وسائل کی وجہ سے مغلوں سے کھلے میدان میں ٹکر نہیں لے سکتا۔ پچھلا تجربہ اس کا ثبوت تھا۔ اس لیے اس نے گوریلا جنگ کا طریقہ اپنایا جس میں اسے خوب کامیابی حاصل ہوئی۔ پہاڑی علاقہ میں یہ ایک آزمودہ طریقہ تھا۔ اس نے

اس کام کے لیے ... ٹھا سپاہیوں کو بھرتی کیا جو اس فن کے ماہر تھے اور بحری چوکیاں قائم کیں جن پر عربی النسل حبشیوں کو مقرر کیا۔

چنانچہ جب خانخاناں نے ۱۶۱۰ء میں دوبارہ احمد نگر پر حملہ کیا تو اسے ملک عنبر کی طاقت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ مغلوں کو گوریلا طریقہ جنگ کا بھی تجربہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ برسات کا موسم شروع ہونے والا تھا۔ قومی مجلس شوریٰ کا مشورہ تھا کہ برسات کے بعد حملہ کیا جائے مگر کچھ افسروں نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا اور خانخاناں ناکافی رسد کے ساتھ برہان پور سے احمد نگر کی طرف بڑھا۔ ملک عنبر نے مغل فوجوں کا راستہ روک دیا۔ اس نے میدان میں جم کر لڑنے سے گریز کیا اور حملے کر کے پہاڑوں میں غائب ہو جاتا تھا۔ اس طرح وہ مغل فوجوں کو پہاڑوں اور دروں کے درمیان گھیر لیتا۔ اس نے راستہ میں تمام کھیتوں کو آگ لگا دی اور رسد کے تمام راستے بند کر دیے۔ شاہی فوجوں میں قحط کی صورت حال پیدا ہو گئی۔ آدمی اور جانور بھوک سے مرنے لگے۔ اُدھر بارش شروع ہو گئی اور خانخاناں کو مجبوراً دکنیوں سے صلح کرنا پڑی۔

یہ ایک ذلّت آمیز صلح تھی جس کی وجہ سے خانخاناں پر ہر طرف سے الزام تراشی ہونے لگی۔ اس پر جلد بازی اور غلط اقدام کرنے کا الزام لگایا گیا آخر کار خانخاناں کو دربار میں واپس بلالیا گیا جہاں بادشاہ نے اس کے ساتھ بے رُخی اور رُوکھے پن کا برتاؤ کیا۔ دکن کی مہم کو خان جہاں اور خانِ اعظم کے سپرد کر دیا گیا۔ خانخاناں کی اس شکست کے بارے میں محمد حسین آزاد نے دربار اکبری میں لکھا ہے :" تکلیف، نقصان، خرابیاں، ندامتیں سب مینہہ کے ساتھ برسیں۔ انجام یہ ہوا کہ جس خانخاناں نے شکست کا داغ نہ کھایا تھا اس نے ۶۲ سال کی عمر میں شکست کھائی۔ فوج برباد، اپنے نہایت تباہ و برباد بڑھاپے کے بوجھ اور ذلّت کی باربرداری کو گھسیٹ کر برہانپور میں پہنچا۔ وہی احمد نگر جسے گولے مار مار کر فتح کیا تھا، قبضہ سے نکل گیا۔"

سب سے اذیت ناک بات یہ تھی کہ مغل امرا نے خانخاناں پر کھلم کھلا غدّاری کا الزام لگایا اور کہا کہ وہ دکنیوں سے سازباز رکھتا تھا۔ سر ٹامس رو نے بھی لکھا ہے کہ" خانخاناں یقیناً دکنیوں سے سازباز کرتا تھا جن سے اسے پنشن ملتی تھی۔"

لیکن تاریخی کتب سے اس الزام کی تصدیق نہیں ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دکنیوں کے تئیں اس کے دل میں نرم گوشہ رہا ہو مگر اس شکست کو غداری نہیں کہہ سکتے۔ خانخاناں کو جب دربار میں بلایا گیا وہ ایک معتوب اور راندہ درگاہ کی زندگی گزار رہا تھا۔ دکن میں خان اعظم اور خان جہاں کی فوجیں شکست کا مُنہ دیکھ رہی تھیں اور پھر آخر کار مجبور ہو کر بادشاہ نے خانخاناں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اسے دکن کی مہم سپرد کی۔

جہانگیر کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ خواجہ ابوالحسن نے خاص طور پر مشورہ دیا کہ خانخاناں دکن کے معاملات سے خوب واقف ہے۔ اس کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ بادشاہ نے خانخاناں کو کالپی اور قنوج کی جاگیریں دیدی تھیں جہاں وہ گوشۂ تنہائی میں زندگی گزار رہا تھا۔ بادشاہ نے اسے طلب کیا اس کے منصب میں اضافہ کیا۔ بیش قیمت تحفے نذر کیے۔ اس مرتبہ بادشاہ نے خانخاناں کے بیٹوں کو بھی نوازا۔ شاہنواز خاں، داراب اور رحمان داد کو نئے مناصب دیے اور باپ کے ساتھ مہم پر روانہ کیا۔ غرض کہ ۱۶۱۲ء میں خانخاناں ایک بار پھر دکن کی جانب کوچ کرتا ہے۔

اس جنگ میں خانخاناں کے بیٹے برابر کے شریک تھے۔ تینوں بیٹوں نے غیر معمولی کارنامے دکھائے۔ خانخاناں کے ساتھ بھی کئی معرکے ہوئے۔ تین سے بھی زائد برسوں تک باپ بیٹے ملک عنبر اور اس کی قیادت میں لڑ رہے دکنیوں کے ساتھ جنگ کرتے رہے۔ جنگی معرکوں، محاذوں اور میدانوں کی تفصیل پیچ در پیچ ہے۔ جنگ کا نتیجہ مغلوں کی فتح کی صورت میں نمودار ہوا۔ خانخاناں نے میر شہری کے ذریعہ بادشاہ کو جنگ کی تفصیلی رپورٹ بھیجی۔ دربار میں شاندار جشن منایا گیا۔ بادشاہ نے شاہنواز کو فرزند کا خطاب دیا اور پانچ ہزار کا منصب۔ اسی طرح داراب اور رحمان داد کو بھی انعامات اور عہدوں سے نوازا۔ خانخاناں نے بیش قیمت سامان بادشاہ کو بھیجا۔

اس زمانہ کا ایک قابل ذکر واقعہ انگریز سیاح سر تھامس رو کی خانخاناں سے ملاقات ہے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ سورت ابھی بھی خانخاناں کی تحویل میں تھا،

پرتگالی اور دوسری یورپی قومیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں اور ان کے جھگڑے تصفیہ کے لیے خانخاناں کے پاس آتے رہتے تھے۔ اسی طرح کا ایک جھگڑا تھا جسے لیکر سرتھامس رو برہان پور میں خانخاناں سے ملا۔ وہ ۴ ارنومبر ۱۶۱۵ء کو برہان پور آیا تھا اور تین ہفتے اس نے وہاں قیام کیا۔ انگریزوں کا جو سامان پرتگالی لے گئے تھے۔ زیادہ تر اس نے انگریزوں کو واپس کرادیا اور خانخانان نے اسے خلعت بھی دیا۔ برہان پور میں شہزادہ پرویز بھی مقیم تھا جو سرکاری طور پر مہم کا انچارج تھا اور فوجیں اس کی کمان میں تھیں۔ مگر ہمیشہ کی طرح شہزادہ محض برائے نام کماندار تھا۔ اصل اختیارات خانخاناں کے ہی ہاتھ میں تھے۔

سرتھامس رو نے شہزادہ پرویز سے ملاقات کا ذکر کیا ہے جس سے متذکرہ بالا بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

" (برہان پور میں) دربار کے باہر تقریباً سو مسلح سوار تعینات تھے۔ یہ شرفا تھے جو شہزادہ کے باہر نکلنے پر آداب بجالاتے تھے۔ شہزادہ دربار میں ایک بلند شہ نشین پر بیٹھا تھا جو گول تھی اور جس کے اوپر چھتری لگی تھی۔ شہزادہ بڑی شان سے بیٹھا تھا مگر اس کے انداز میں بے ڈھنگا پن تھا۔ سامنے قالین بچھا تھا۔ لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا جب میں قریب پہنچا تو ایک افسر میرے پاس آیا اور مجھے اپنی پیشانی زمین پر رکھنے اور ٹوپی اتارنے کے لیے کہا۔ میں نے کہا میں باعزت مہمان ہوں اور یہاں کے ملازمین کے قاعدوں کا پابند نہیں۔ چنانچہ میں آگے بڑھ گیا اور ایک جنگلے کے قریب شہزادہ کے پاس پہنچ گیا اور آداب بجالایا۔ شہزادہ نے اپنے جسم کو میری جانب موڑا۔ میں جنگلے کے اندر داخل ہوگیا جہاں عمائدین شہر دستہ بدستہ غلاموں کی طرح کھڑے تھے۔ ایک بیش قیمت شامیانہ اوپر اور قالین کا فرش نیچے تھا۔ دربار کا نقشہ ٹھیک ایک تھیٹر کی طرح تھا اور شہزادہ تھیٹر کے مصنوعی بادشاہ کی طرح بیٹھا تھا۔ جب میں اندر پہنچ گیا تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میری جگہ کہاں ہے۔ میں شہزادہ کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا جو تین سیڑھی اوپر تھا اور جہاں اس کے سکریٹری کے ذریعہ حکم پہنچایا جاتا تھا۔ لیکن تمام شان وشوکت اور ٹھاٹھ باٹ کے باوجود یہ صاف ظاہر تھا کہ شان وشوکت تو شہزادہ کی ہے

لیکن حکومت خانخاناں کی ہے۔"

احمد آباد کے ایک انگریز افسر مسٹر کیرج کے کہنے پر سر تھامس رو پرویز کے دربار میں گیا تھا جس نے خاص طور پر اپنے خط میں اس کی سفارش کی تھی اور اس نے بھی یہی لکھا تھا کہ شہزادہ ایک نکما و ناکارہ شخص ہے۔ دماغی طور پر کمزور ہے اصل شخص خانخاناں ہے جس کا حکم چلتا ہے جو امرا میں ممتاز ہے اور بہادری میں پورے ملک میں یکتا ہے۔ اس کے بعد خانخاناں کی زندگی کا وہ آشوب دور شروع ہوتا ہے جب اسے طرح طرح کی ذلتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

٨

شہزادہ خرم اور خانخاناں

۱۶۱۶ء میں جہانگیر نے اپنے بیٹے شہزادہ خرم کو دکن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ خود شہزادہ کی بھی فاتح دکن بننے کی خواہش تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ پورے دکن کو ہمیشہ کے لیے مغلوں کے جھنڈے تلے لے آتے۔ اسے یہ بھی خیال رہا ہوگا کہ اس کے بھائی اس مہم میں کامیاب نہیں رہے تھے اور اگر وہ کامیاب ہوگیا تو زیادہ عزت و شہرت کا حقدار ہوگا۔ خانخاناں اور اس کے ساتھی امرا بادشاہ کی اس تجویز کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ کیونکہ شہزادہ نے بادشاہ کے سامنے یہ بھی شرط پیش کی تھی کہ خانخاناں کو دکن سے واپس بلالیا جائے اس لیے کہ وہ تن تنہا دکن کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ جب شہزادہ کو معلوم ہوا کہ خانخاناں نے دکن سے آنے سے انکار کر دیا ہے تو شہزادہ نے اپنے ایک امیر عبداللہ خاں کو دکن بھیجا تاکہ وہ خانخاناں سے چارج لے لے۔ لیکن بادشاہ نہیں چاہتا تھا کہ خرم اور خانخاناں کے درمیان جھگڑا ہو اس لیے اس نے خانخاناں کو دکن میں رہنے دیا اور عارضی طور پر جھگڑا ٹل گیا۔

مگر نورجہاں اور اس کے ساتھی خرم کو دکن بھیجنے پر مصر تھے۔ چنانچہ بادشاہ کو مجبوراً فیصلہ کرنا پڑا۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ دکن پر مستقل مغلوں کا تسلط قائم ہو جاتے۔ شہزادہ پرویز کو دکن سے تبدیل کر کے الہ آباد بھیج دیا اور اس کی جگہ خرم نے لے لی جسے بادشاہ نے شاہ کا خطاب دیا۔ ویسے تو وہ تھا بھی ولیعہد چونکہ دربار میں بھی بادشاہ کے برابر دائیں جانب پر بیٹھتا تھا۔ خانخاناں کے لیے بادشاہ کے حکم کو ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ اس مرتبہ خود جہانگیر نے

مانڈو میں پڑاؤ ڈالا تاکہ وہ میدان جنگ کے قریب رہے۔

شہزادہ نے جب نربدا پار کیا تو خانخاناں اور دوسرے منصب دار اس کی پیش قدمی کے لیے وہاں پہنچے۔ شہزادہ خرم اپنے بھائیوں کے مقابلہ میں دکن کے معاملات کو سلجھانے میں زیادہ کامیاب رہا۔ اس نے چند ہی ماہ میں دکن کے بہت سے حکمرانوں کو بات چیت کے ذریعہ اپنا مطیع و فرمانبردار بنالیا۔ دکن میں ملک عنبر کا بنایا ہوا وفاق ٹوٹ رہا تھا اور دکنی مسلسل خونریزی سے اُکتا گئے تھے۔ ابراہیم عادل شاہ دوم نے شہزادہ خرم کی آمد کی خبر سنی تو اس نے بھی امن و صلح کے سفیر بھیجے اور دکنی سپہ سالاروں کی طرف سے ۱۵ لاکھ کے تحائف شہزادہ کی خدمت میں پیش کیے۔ بالاگھاٹ کا پورا علاقہ جسے ملک عنبر نے اپنے قبضے میں کر رکھا تھا مغلوں کو واپس لوٹا دیا اور احمد نگر کی چابیاں بھی انھیں دیدی گئیں۔

شہزادہ نے جب معاہدہ کی تمام شرطوں کو دکنیوں سے پورا کرالیا تو وہ ۳۰ ستمبر ۱۶۱۷ء کو تمام فوجوں اور جنگی ساز و سامان کے ساتھ مانڈو میں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خانخاناں بھی اس کے ہمراہ تھا۔ وہ اس طرح باپ کے سامنے اپنی طاقت کا بھی مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ بادشاہ شہزادہ کی اس کامرانی سے بہت خوش ہوا اور اسے شاہجہاں کا خطاب دیا جو اس نے بادشاہ بننے کے بعد باقی رکھا۔

اسی سال خانخاناں کے بیٹے شاہنواز کی بیٹی کی شادی خرم سے کر دی گئی۔ خرم کی سفارش پر خانخاناں کو برار، خاندیش اور احمد نگر کا صوبیدار مقرر کر دیا گیا۔ اسی سال خانخاناں کے بیٹے امراللہ نے بارک پور (گونڈوانہ) کی ہیرے کی کانوں پر قبضہ کرلیا جو ایک زمیندار پوجا کے قبضہ میں تھی جس کے ہیرے اپنی خوبصورتی اور چمک میں پورے ہندوستان میں مشہور تھے جس کا ذکر ہوچکا ہے۔ اسی سال کثرت شراب نوشی سے مرزا ایرج کا بھی انتقال ہوگیا اور اس کے دو سال بعد رحمان داد بھی چل بسا۔

ملک عنبر نے پھر اپنے کو منظم کرنے کی کوشش کی اور بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں سے معاہدہ کرلیا۔ شہزادہ اور خانخاناں نے ملکر اس کا مقابلہ کیا اور ایک بار پھر اسے مار بھگایا۔ دکنیوں نے کھڑکی کے مقام پر پناہ لی جو اب احمد نگر کا

نیا دار الخلافہ تھا بعد میں اورنگ زیب نے اسے آباد کیا اور جو آج اورنگ آباد کے نام سے مشہور ہے۔

اس مرتبہ دکن کی جنگ سیاسی زیادہ تھی۔ شہزادہ کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا اور ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ خانخاناں تو دکنیوں کے ساتھ ساز باز رکھتا ہے اور سب کچھ شہزادے نے کیا ہے اور یہ سیاسی پروپیگنڈہ کامیاب بھی رہا جبکہ فوجی صورت حال میں کوئی بہت زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔

شاہجہاں کی بغاوت

اپنے باپ کے خلاف شاہجہاں کی بغاوت خانخاناں کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہیں سے خانخاناں کے سیاسی زوال کا آغاز ہوتا ہے۔ جب اس کی زندگی کی شام تھی وہ مطعون و خوار ہوا۔

دربار میں نورجہاں کا اثر برابر بڑھ رہا تھا۔ اہم کلیدی عہدوں پر اس نے اپنے آدمی مقرر کر دیے تھے۔ ۱۶۲۱ء میں وزیر اعظم عماد الدولہ کا انتقال ہوا تو، جہانگیر نے وزارت عظمیٰ بھی نورجہاں کے سپرد کر دی۔ اس تقرر سے نہ صرف یہ کہ شاہجہاں ناراض ہوا بلکہ بہت سے ممتاز امرا کو بھی ناگوار گزرا۔ جہانگیر کے بعد سلطنت مغلیہ کا تاج کس کے سر پر رکھا جائے گا اس سوال پر امرا و شہزادے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ شہزادہ شہریار بھی تخت کا امیدوار تھا۔ وہ جہانگیر کا بیٹا تھا۔ نورجہاں نے اس کی شادی اپنی بیٹی لاڈلی بیگم سے کر دی تھی جو اس کے پہلے شوہر شیر افگن سے پیدا ہوئی تھی اور وہ اس طرح نورجہاں کا داماد بھی تھا اور وہ اسی کو بادشاہ بنانا بھی چاہتی تھی۔ جہانگیر اپنی مے نوشی کی وجہ سے انتظامی معاملات سے دستبردار ہوتا جاتا تھا اور زیادہ تر نورجہاں کے فیصلوں پر عمل کرتا تھا۔ صرف خطبہ میں نورجہاں کا نام نہ تھا باقی اسی کا حکم چلتا تھا۔ جہانگیر برائے نام بادشاہ تھا۔ نورجہاں نے دربار پر پورا تسلط قائم کرنے کے لیے شاہجہاں اور خانخاناں دونوں کو ناراض کر دیا۔

۱۶۲۲ءمیں ایران کے بادشاہ شاہ عباس صفوی نے قندھار پر حملہ کر دیا۔ یہ آخری مغل علاقہ تھا جو مغلوں کے پاس رہ گیا تھا۔ جہانگیر نے شاہجہاں اور خانخاناں کو دکن سے واپس طلب کرلیا اور انھیں قندھار کی مہم پر بھیجنے کا حکم دیا۔ نورجہاں کا ایک مقصد تھا کہ شاہجہاں باپ سے دور رہے اور وہ اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاکر شہریار کے لیے راستہ صاف کر دے۔ وہ ابھی قندھار پر حملہ کی تیاری کر رہے تھے کہ دھولپور کا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دھولپور کو شہریار اور خرم دونوں اپنی جاگیر مانتے تھے۔ شاہجہاں نے بادشاہ کو باخبر بھی کیا تھا کہ اگر دھولپور شہریار کو دیدیا گیا تو اس کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔ نورجہاں کے کہنے سننے پر بادشاہ نے دھولپور کی جاگیر شہریار کے نام لکھدی۔

شاہجہاں نے دھولپور پر حملہ کر دیا اور نہ صرف دھولپور بلکہ دوسرے خالصہ علاقوں کو بھی اپنے قبضہ میں کرلیا۔ بادشاہ شاہجہاں کی اس حرکت سے بہت ناراض ہوا اور اس نے غصہ میں قندھار کی مہم بھی اس کے نام سے منسوخ کر کے شہریار کو دیدی۔ شاہجہاں کو بڑا دکھ ہوا۔ اس نے بادشاہ کے پاس کئی عرضداشتیں بھی بھیجیں مگر کوئی اثر نہیں ہوا۔ شاہجہاں حقیقت میں صلح چاہتا تھا۔ اس نے بادشاہ سے ملاقات کا وقت مانگا جو نہیں دیا گیا۔ نورجہاں، بیٹے کو باپ سے ملنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ شاہجہاں نے قاضی عبدالعزیز کو اپنا ایلچی بنا کر بھیجا۔ مگر اس کی بات سننے کے بجائے اسے بھی گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ مجبوراً شاہجہاں کو علم بغاوت بلند کرنا پڑا۔ اس بغاوت میں خانخاناں نے شاہجہاں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ساتھ اس کا بیٹا داراب خاں بھی تھا۔

جہانگیر کو خانخاناں کے اس طرز عمل سے بہت تکلیف پہنچی۔ وہ تزک میں لکھتا ہے "جب خانخاناں جیسے امیر نے جو میری اتالیقی کے منصب پر فائز تھا۔ ستّر برس کی عمر میں کافرنعمتی (غداری) سے منہ کالا کیا تو اوروں سے کیا گلہ گویا اس کی سرشت میں بغاوت اور کافرنعمتی تھی۔ اس کے باپ (بیرم خاں) نے اخیر عمر میں میرے پدر بزرگوار (اکبر) کے ساتھ یہی شیوہ ناپسندیدہ کیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی پیروی کی اور اس عمر میں اپنے تئیں مطعون اور مردود ازل و ابد کیا۔"

معلوم نہیں کیا حالات تھے کہ خانخاناں اپنے فیصلہ پر قائم نہ رہ سکا۔ شاہجہاں کا ساتھ چھوڑ کر جہانگیر سے جا ملا۔ وہ بے یقینی کا شکار ہو گیا۔ شاید اسے غلطی کا احساس ہوا ہو کہ اس نے بادشاہ کے مقابلہ میں شہزادہ کا ساتھ دے کر غلطی کی تھی۔ یا شاید وہ دونوں میں صلح کرانا چاہتا تھا۔ یا اسے شاید یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ شہزادہ یہ جنگ جیت نہیں سکے گا۔ خانخاناں کو اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا تھا یا انتہا درجہ کی چالاکی تھی کہ وہ دونوں سے سُرخرو ہونا چاہتا تھا۔ اس نے بادشاہ کو پیغامات بھیجنے شروع کیے کہ وہ تو شاہجہاں کے ساتھ بہ مجبوری ہے اور اس کے لیے موقع نہیں کہ بادشاہ کے حضور میں حاضر ہو۔ ایسا ہی خط جو اس نے بادشاہ کی تعریف میں مہابت خاں کو لکھا تھا شاہجہاں کے آدمیوں کے ہاتھوں میں پڑ گیا۔ خط کے نیچے ایک شعر[1] بھی لکھا تھا جس کا مطلب تھا کہ مجھ پر سیکڑوں لوگوں کی نگاہیں ہیں ورنہ تو میں اس مصیبت سے کبھی کا نکل کھڑا ہوتا کیوں کہ امرا ایک ایک کر کے شہزادے کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ یہ کھلی ہوئی غدّاری تھی۔ شاہجہاں نے بازپُرس کی مگر خانخاناں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ شاہجہاں نے خانخاناں اور اس کے بیٹوں کو حراست میں لے لیا۔ ان پر کڑی نظر رکھی جانے لگی داراب خاں بھی شاہجہاں کی حمایت سے دستبردار ہو گیا تھا۔

خانخاناں کو اپنے بیٹوں سے بہت محبت تھی۔ پدرانہ شفقت اس کے پاؤں کی بیڑی بن گئی تھی۔ وہ اپنے کو کمزور محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی سب سے بڑی تشویش تھی کہ کسی طرح اس کے بیٹوں کی جان بچ جاتی۔ ماثرالامرا میں لکھا ہے کہ جس وقت شہزادہ پرویز اور مہابت خاں، شاہجہاں کا پیچھا کر رہے تھے اور اسے دکن سے باہر بھگانا چاہتے تھے تو خانخاناں نے راجہ بھیم کو خانخاناں کے بیٹے جس کی قید میں تھے ایک درد بھرا خط لکھا تھا جس میں وہ لکھتا ہے " اگر شہزادہ (شاہجہاں) اس کے لڑکوں کو رہا کر دے تو وہ شاہی فوجوں کا رُخ موڑ دے گا اور اگر اس کی بات نہ مانی تو شاہجہاں کو زیادہ سنگین حالات کا سامنا کرنے

---

[1] صد کس بنظر نگاہ می داریم — ورنہ بپریدی ز بے آرامی

کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔" یہ ایک طرح کی دھمکی بھی تھی۔ راجہ بھیم نے بھی سخت جواب دیا کہ ابھی شاہی فوجیں کافی طاقتور ہیں اگر اس نے کوئی حرکت کی تو نہ صرف یہ کہ اسے بلکہ اس کے بیٹوں کو بھی ختم کر دیا جائے گا۔ خانخاناں یہ جواب پا کر خاموش ہو گیا۔

شاہجہاں کو ہر طرف سے ناکامی کا سامنا تھا۔ وہ خانخاناں اور اس کے بیٹوں پر بھروسہ کرتا تھا مگر وہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ مہابت خاں کی چالاکی نے شاہجہاں کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ اس نے خاموشی کے ساتھ ایک خط خانخاناں کو لکھا جس میں کہا "شہزادہ بھی بادشاہ کے ساتھ صلح کرنے پر آمادہ ہے۔ اب وقت آگیا ہے جب باغی اور سازشی اپنے کیفر کردار کو پہنچیں گے۔ اس نے مزید لکھا کہ سلطنت کی حفاظت اور امن وامان ہم دونوں کا واحد مقصد ہے۔ آپ شہزادہ کو سمجھائیں اور ایک دد اشخاص کو ثالث کے طور پر بادشاہ کی خدمت میں بھیجنے کا بندوبست کریں تاکہ مزید خون خرابہ نہ ہو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ بادشاہ شہزادہ کو مزید جاگیریں اور اعزازات عطا کریں گے۔ شہزادہ مزاحمت کی پالیسی چھوڑ دے گا" وغیرہ۔ یہ خط مہابت خاں نے اس طرح بھیجا کہ شاہجہاں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ ایسا ہی ہوا بھی، اور یہی مہابت خاں کا مقصد بھی تھا۔ وہ ایک طرف یہ چاہتا تھا کہ خانخاناں اور شہزادہ کے درمیان اختلاف کی خلیج وسیع ہو جائے اور دوسری طرف وہ شہزادہ پر نفسیاتی اثر ڈالنا چاہتا تھا تاکہ اس کا حوصلہ پست ہو جائے اور وہ ہتھیار ڈال دے۔ اس مقصد میں مہابت خاں کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔

اب خانخاناں کا وقار بادشاہ کی نظروں میں بھی گر چکا تھا۔ وہ ایک طرح سے نظربند کر دیا گیا جہاں اس کا خیمہ لگایا جاتا، شہزادہ پرویز کا خیمہ اس کے برابر لگایا جاتا تاکہ خانخاناں کی نقل وحرکت پر نظر رکھی جا سکے۔ اس کی بیوہ بیٹی جانا بیگم بھی قید میں اس

لے مآثرالامرا میں خانخاناں کی چالاکی کے بارے میں ایک شعر بھی لکھا جس کا اردو ترجمہ کچھ اسطرح۔

ایک چھوٹا قد اور دل میں سیکڑوں پیچ وخم
مٹھی بھر ہڈیاں اور سو مکاریاں

کے ساتھ تھی۔ شاہجہاں کی اس بغاوت میں خانخاناں کا وفادار غلام اور بہادر جنگجو ساتھی میاں فہیم بھی قتل ہوگیا۔

جہانگیر نے تزک میں لکھا ہے کہ جب خانخاناں کو ثالث بنا کر بادشاہ کے پاس بھیجا جا رہا تھا تو شاہجہاں نے اس سے گڑگڑا کر کہا تھا۔ "مجھ پر کٹھن وقت آن پڑا ہے۔ میری حالت نازک ہے۔ میں خود کو تمہارے حوالے کرتا ہوں اور اپنی عزت و آبرو کا محافظ بناتا ہوں۔ تم بادشاہ کے سامنے میری اس طرح وکالت کرنا کہ میرے لیے جو نفرت اور غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے وہ ختم ہو جائے۔" شاہجہاں نے قرآن اس کے ہاتھ میں دیکر حلف وفاداری لیا۔ اس پر بھی اطمینان نہ ہوا تو خانخاناں کو حرم میں لے گیا جہاں بیگمات کے سامنے اس سے قسمیں وعدے لیے۔ مگر افسوس کہ خانخاناں نے کسی بات کی بھی پرواہ نہ کی اور اس نے شاہی کیمپ میں پہنچ کر شاہجہاں کو بالکل فراموش کر دیا۔ ممکن ہے اگر خانخاناں اپنا یہ مشن ایمانداری سے پورا کرتا تو بادشاہ اور شہزادہ دونوں کی نظروں میں سرخرو ہو جاتا مگر شاہجہاں سے بے وفائی کر کے خانخاناں نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔

شاہجہاں کے حکم سے داراب کے بیٹے اور بھتیجے کو قتل کر دیا گیا ادھر جہانگیر کی فوجوں نے داراب کو بھی گرفتار کر لیا۔ وہ شکست خوردہ سلطان پرویز کے سامنے پیش ہوا۔ مہابت خاں نے بادشاہ سے داراب خاں کے قتل کا حکم حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ مہابت خاں نے حکم دیا کہ داراب کا سر کاٹ کر خانخاناں کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس کا سر کاٹ کر دسترخوان میں کھانے کی طرح سجا کر باپ کے سامنے لایا گیا۔ سپاہیوں نے کہا "مہابت خاں نے تربوز بھیجا ہے۔" خانخاناں سمجھ گیا اور آبدیدہ ہو کر بولا۔ "تربوز تو ہے لیکن شہیدی ہے۔" (یعنی شہید کا سر ہے)

خانخاناں کو دربار میں طلب کر لیا گیا۔ مہابت خاں نے بڑی عزت کے ساتھ اسے روانہ کیا۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے "بیسویں سال جلوس جہانگیری میں جہانگیر بادشاہ نے اس کو (خانخاناں) مہابت خاں کے پاس سے حضور میں طلب کر کے اس کے جرموں کو معاف کر دیا اور خود معذرت کی کہ یہ سب باتیں ہماری تقدیر میں لکھی تھیں۔ ہمارے تمہارے اختیار میں نہ تھیں۔ میں خود تم سے زیادہ شرمندہ ہوں۔

اور ایک لاکھ روپیہ انعام دیا کہ اپنی حالت شدھار لو۔ منصب بحال کیا۔ خانخاناں کا خطاب جو چھن گیا تھا اور مہابت خاں کو دیدیا گیا تھا واپس خانخاناں کو مل گیا۔ قنوج کی جاگیر مرحمت ہوئی۔ خانخاناں نے اس موقعہ پر جہانگیر کے عنایت وکرم پر یہ شعر لکھا اور جسے انگوٹھی میں کندہ کرایا۔

مرا لطفِ جہانگیری ز تائیدات یزدانی
دوبارہ زندگی دادہ، دوبارہ خانخانانی

خانخاناں اپنی جاگیر قنوج کے لیے روانہ ہوا مگر اس کا ستارہ گردش میں تھا۔ مہابت خاں نے اسے وہاں جانے سے روک دیا اور واپس دربار میں بھیج دیا۔ خانخاناں بادشاہ سے اجازت لیکر لاہور چلا گیا جہاں شاید وہ مستقل قیام کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت اس کی عمر ۷۳ سال تھی۔

اسی دوران دربار میں ایک اور تبدیلی واقع ہوئی۔ نورجہاں اور اس کے ساتھی امرا کا اثر ختم ہوگیا۔ اصل طاقت مہابت خاں کے ہاتھ میں تھی۔ نورجہاں پارٹی کو اس نے ایک طرح سے قیدی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نورجہاں مہابت خاں کے چنگل سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔ مصیبت کی اس گھڑی میں اسے بوڑھے خانخاناں کی یاد آئی۔ اس نے پیش کش کی کہ وہ مہابت خاں کے خلاف جنگ کرے۔ بارہ لاکھ روپے۔ اجمیر کی صوبہ داری۔ ہیرے جواہرات۔ ہاتھی گھوڑے اس مہم کے لیے خانخاناں کو پیش کیے۔ سات ہزاری منصب دیا۔ خانخاناں کی صحت اب اس قابل نہ تھی کہ وہ اتنی بڑی مہم کا بوجھ اٹھا سکتا۔ تاہم وہ لاہور سے دلّی کے لیے روانہ ہوا اور ابھی دلّی پہنچنے بھی نہیں پایا تھا کہ راستہ میں انتقال ہوگیا۔ مآثرالامرا میں اس کی موت کا سال ۱۰۳۶ھ دیا ہے جو ۱۶۲۷ء ہوتا ہے۔ اس سال کے وسط میں اس کا انتقال ہوا۔ محمد حسین آزاد نے بھی موت کا یہی سال لکھا ہے۔ خانخاناں کی موت کے ساتھ ایک ہنگامہ خیز اور عہد ساز زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کی موت کے چند ماہ بعد جہانگیر بھی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ جہانگیر کی موت ۱۹ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو ہوئی۔ اس نے ۵۸ سال عمر پائی اور ۲۲ سال حکومت کی۔ خانخاناں کو دلّی میں اس کی بیوی کی قبر کے قریب دفنایا گیا جہاں اس کا مزار آج بھی موجود ہے اور جسے خود خانخاناں نے اپنی زندگی ہی میں تعمیر کرا دیا تھا۔

۹

سیرت و شخصیت

عبدالرحیم خانخاناں کی رگوں میں دو عظیم الشان خاندانوں۔ ترکوں اور منگولوں۔ کا خون دوڑ رہا تھا اور وہ ایرانی تہذیب و تمدن کی فضا میں پروان چڑھا تھا۔ اس کی ماں ہندی نژاد ایک میواتن خاتون تھی۔ اس زمانہ میں ترک۔ منگول۔ ایرانی اور ہندوستانی، یہی چار طاقتیں تھیں جن کی شجاعت و بہادری۔ تہذیب و تمدن اور علم و ہنر کے چاروں طرف چرچے تھے۔ خانخاناں کی شخصیت میں یہی چار عناصر باہم شیر و شکر ہو گئے تھے۔ ترکوں اور منگولوں سے اسے شجاعت و حریّت فکر ملی تھی، ایرانی تہذیب نے اسے اخلاق و آداب سکھائے تھے اور علم و ہنر سے آراستہ کیا تھا۔ ہندوستانی ماں کی گود میں اس نے عرفان و بھکتی۔ رواداری اور محبت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خانخاناں ان چاروں تہذیبوں کی اعلیٰ ترین قدروں کا بہترین نمونہ نظر آتا ہے۔ اس کی شخصیت کی ہمہ جہتی اور رنگا رنگی کی وجہ بھی یہی تھی۔ اس عہد کی پوری دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو عبدالرحیم خانخاناں کے ہم پلّہ کوئی دوسری شخصیت دکھائی نہیں دیتی۔ خاص طور پر تمام مسلم ممالک میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جس کا تقابل خانخاناں سے کیا جاسکے۔ اس کی ذات سے اگرچہ غلطیاں سرزد نہ ہوتیں تو اسے آسانی سے "مریادا پرشوتم" کا خطاب دیا جاسکتا تھا۔

بیرم خاں شیعی عقائد رکھتا تھا مگر خانخاناں اپنے کو سُنّی کہتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ شیعہ ہے اور تقیہ کر کے اپنے اصل عقائد کو چھپاتا ہے۔ اس پر یہ بھی الزام تھا کہ وہ دکنی حکمرانوں سے ساز باز رکھتا تھا کیونکہ وہ شیعہ تھے۔ مگر ہم عصر شواہد سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیعہ نہیں تھا۔ شیخ احمد سرہندی اور شیخ عبدالحق محدث کی تحریروں سے بھی اس کا سُنّی والجماعت ہونا ثابت ہے۔ اس کے بیٹے اعلانیہ سُنّی الجماعت تھے۔ اس کی ماں سُنّی تھی۔

شیعوں کو مراعات و عہدے دینے کا بھی اس پر الزام نہیں تھا جو شیعوں کے بارے میں ایک عام الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ اسی حد تک مذہبی انسان تھا کہ ارکان اسلام کی پابندی کرتا تھا۔ اس نے اکبر کا دین الہی بھی قبول نہیں کیا تھا اگرچہ بادشاہ اسے اپنا مرید کہتا تھا۔ خانخاناں کا مذہب انسانیت تھا وہ صوفیا کے مسلک کا پیروکار تھا اور عقیدہ کی بنا پر کسی سے امتیاز نہیں برتتا تھا۔ اس کے رفیق و دوست اور ساتھ کام کرنے والوں میں ہندو بھی تھے۔ شیعہ بھی اور سنی بھی۔ اس کا فیض سبھی کو پہنچتا تھا۔ لیکن بلاشبہ اس کی فکر میں شیعی اثرات کی کارفرمائی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

خانخاناں خوبصورت اور وجیہہ انسان تھا۔ مصور اس کی تصویریں بناکر بیچتے تھے جو لوگ گھروں اور دکانوں میں سجاوٹ کے طور پر لگاتے تھے۔ عورتیں اسے دیکھ کر اس پر عاشق ہو جاتی تھیں۔ وہ مجلسی انسان تھا۔ گفتگو کے آداب سے واقف تھا۔ جب بات کرتا لوگ ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ شیریں کلامی۔ بزلہ سنجی اور لطیفہ گوئی سے وہ محفل پر چھا جاتا۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اعلیٰ خاندان کی ایک حسین و جمیل عورت خانخاناں پر عاشق ہوگئی۔ اس نے خادمہ کو مقرر کیا کہ کسی طرح خانخاناں کو اس کے پاس لے آئے۔ یہ بھی کہلوایا کہ وہ خانخاناں جیسے خوبرو بیٹے کی ماں بننا چاہتی ہے۔ اس عورت نے اپنی تصویر بھی خانخاناں کے پاس بھجوائی۔ خانخاناں نے خادمہ کے ذریعہ جواب بھجوایا بی بی! یہ کام تو مشکل نہ تھا۔ میں تمہاری خواہش کو ضرور پورا کرتا لیکن خدا معلوم اولاد ہو نہ ہو اور اگر ہو بھی تو ضروری نہیں کہ لڑکا ہی پیدا ہو اور وہ زندہ بھی رہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ میری شکل وصورت کا نہ ہو۔ اس لیے میں یہی عرض کروں گا کہ مجھے اپنا بیٹا سمجھو اور خدا کا شکر ادا کرو کہ ایک پلا پلایا بیٹا تمہیں دیا۔ میں اپنی ماں کو جس قدر روپیہ دیتا ہوں۔ اتنا ہی تمہیں بھی بھیجتا رہوں گا۔

اس واقعہ سے خانخاناں کی سیرت کے ایک پہلو پر نظر پڑتی ہے کہ وہ عیاش نہیں تھا۔ ماہ بانو کے علاوہ ایک دو لونڈیاں اس کے حرم میں تھیں اس کی زیادہ تر اولاد ماہ بانو سے ہی پیدا ہوتیں۔ شراب سے بھی اسے کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ جبکہ شراب نوشی اور عیاشی مغلوں میں عام تھی۔ محمد حسین آزاد نے خانخاناں کی شراب نوشی کے بارے میں لکھا ہے "اگر دربار کی پارٹیوں میں گھر جاتے تو شراب بھی پی لیتے تھے۔ ایک مرتبہ

خاندیش سے دربار میں بلایا گیا۔ وہاں شب عاشورہ کو محفل میں امرا جمع ہوتے۔ اس کے بیان میں ملا صاحب (بدایونی) کیا مزے سے چٹکی لیتے ہیں' اسی مجلس میں ساقی نے جام بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے خانخاناں کو پیش کیا' ملا صاحب جو چاہیں فرمائیں مگر یہ تو کہیں زمانہ کیا تھا۔ جن صحبتوں میں صدر شریعت اور مفتی اسلام خود مانگ کر جام لے۔ وہاں خانخاناں بادشاہ کا دیا ہوا جام نہ پی جاتے تو کیا کرے۔ یہ بیچارہ ایک ترک بچہ سپاہی زادہ تھا۔"

اس واقعہ سے بھی خانخاناں کی پارسائی ہی ظاہر ہوتی ہے۔ ہم عصر کسی بھی تاریخ میں اس کی عیاشی یا شراب نوشی کا ذکر نہیں ہے۔ اس عہد میں ان دونوں برائیوں سے پرہیز خانخاناں کی سیرت کی پاکیزگی اور اس کے کردار کی بلندی کو ظاہر کرتا ہے۔

بعض تاریخوں میں خانخاناں کو کینہ ور، زمانہ ساز اور دنیا پرست کہا ہے۔ شیخ احمد سرہندیؒ اسے جاہ پرست اور انا پرست بتاتے ہیں۔ خود اس نے اپنے خطوں میں لکھا ہے کہ دشمن کو دوست بنا کر مارنا چاہیے اور نیز چالوں کے بغیر کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مگر چالوں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہیے۔ اس کی غیر معمولی سخاوت اور دریا دلی کے بارے میں بھی لوگ کہتے ہیں کہ دکھاوا کرتا ہے۔ جاہ پرست ہے۔ نام و نمود کی خواہش ہے۔ خانخاناں بنیادی طور پر ایک فوجی اور سیاسی شخص تھا۔ دربار کی ریشہ دوانیوں اور باہمی کشمکش کے ماحول میں جہاں ہر شخص ایک دوسرے سے بازی بچانے کی اندھی دوڑ میں مصروف تھا۔ اپنے وجود کی بقا کے لیے اتنی ہوشیاری اور چالاکی تو ضروری تھی۔ خانخاناں میں ڈپلومیسی کی یہ خوبی اگر نہ ہوتی تو وہ اتنے بلند مقام تک نہ پہنچ پاتا۔

خانخاناں کو شاہی عدالتوں اور دربار کی خبروں کی جانکاری رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے بازار و محلوں میں اپنے لوگ چھوڑ رکھے تھے جو دن بھر کی خبریں اس تک پہنچاتے تھے۔ اہم مقامات پر چوکیاں قائم کر رکھی تھیں جہاں سے خبریں اس تک پہنچتی رہتی تھیں۔ رات کی تنہائی میں خانخاناں ان سب خبروں کا مطالعہ کرتا اور مطالعہ کے بعد کاغذوں کو جلا دیتا تھا۔

خانخاناں کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ وہ اپنا ذاتی کام یا شاہی کام نکالنے کے لیے

اپنے مرتبہ کا بھی خیال نہ کرتا تھا۔ دشمنوں سے بھی بگاڑتا نہیں تھا۔ نہ جانے کب کوئی کام آجاتے۔

داد و دہش اس زمانہ کا عام فیشن تھا۔ یہ خوبی محض خانخاناں کی ذات کے ساتھ منسوب نہ تھی۔ امرا و شہزادے فلاحی کاموں میں بے دریغ روپیہ خرچ کرتے تھے۔ بلا شبہ اس سے انھیں شہرت ملتی تھی جو وہ چاہتے تھے بلکہ ایسے کاموں کی خاص طور پر تشہیر کی جاتی تھی کہ عوام کے دلوں میں ان کی عزت بڑھے۔ اہل ہنر اور اہل کمال کی سرپرستی بھی اسی زمرہ میں آتی تھی۔ ایک طرح سے یہ نشریات کے ادارے تھے جن سے بادشاہ، امرا اور شہزادے اپنے شخصی امیج کو عوام کے ذہنوں پر نقش کرتے تھے خانخاناں بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ تاہم اس میدان میں وہ دوسرے لوگوں سے بازی لیے ہوتے تھا۔ بادشاہ کی طرح خود اس کا دربار تھا جس میں اہل علم و ہنر باقاعدہ ملازم تھے۔ خانخاناں میدان جنگ یا سیاسی زندگی میں دوست دشمن کی تمیز نہیں کرتا تھا۔ جیسا موقع ہوتا ویسا ہی کرتا۔ ابتدائی ایام میں ابوالفضل اور وہ دونوں دوست تھے۔ گجرات اور سندھ کی مہمات کے دوران دونوں میں دوستانہ خط و کتابت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے غمگسار اور دمساز معلوم ہوتے ہیں۔ گھریلو زندگی کے دکھ سکھ کے شریک ہیں۔ لیکن دکن کی مہم کے دوران جب بادشاہ ابوالفضل کو بھی فوج کی کمان دے کر دکن بھیجتا ہے۔ خانخاناں کے ساتھ اس کے تعلق کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ یہاں خانخاناں اپنے دیرینہ دوست کو طرح طرح سے ذہنی اذیتیں پہنچاتا ہے۔ ابوالفضل اپنے خطوں میں بادشاہ سے آہ و زاری کرتا ہے اور خانخاناں کی شکایت کرتا ہے۔ خانخاناں کی شخصیت کا یہ الگ ہی روپ ہے۔

شجاعت ایک سپاہی کا زیور ہوتی ہے۔ رحیم اس زیور سے آراستہ تھا۔ وہ ایک کامیاب فوجی حکمت عملی تیار کرنے میں ماہر تھا۔ ہم اسے آج کے زمانہ کا بہترین اسٹریجیسٹ کہہ سکتے ہیں۔ اکثر اس نے بہت کم فوجوں کے ساتھ حریف کی کئی گنا فوجوں کے قدم اکھاڑ دیے۔ سرکھیج کے مقام پر تو وہ بڑی بے سروسامانی کے عالم میں لڑا اور کامیاب رہا۔ وہ جنگوں کے نقشے بنانے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ بعض مرتبہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محض اس کی ذاتی صفات کی وجہ سے کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ دشمن کی فوجوں کو دھوکے میں رکھنا۔ ان کے رازوں سے واقف ہونا۔ صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کرنا اور پھر

زندگی یا موت کا نعرہ لگاتے ہوئے میدان جنگ میں کود پڑنا۔ یہ خانخاناں کا طرۂ امتیاز تھا۔ شاید خانخاناں کی انہی خوبیوں کی وجہ سے ایران کا بادشاہ شاہ عباس اکثر کہا کرتا تھا۔ ''کاش خانخاناں جیسا سپہ سالار میرے پاس ہوتا تو میں تمام کاروبار سلطنت اس پر چھوڑ کر خود عیش و عشرت میں زندگی گزارتا۔''

خانخاناں سے جو بڑی سیاسی غلطی ہوئی وہ اس کی سیرت کی کمزوری کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ جہانگیر اور اس کے بیٹے شاہجہاں کے درمیان جنگ میں خانخاناں نے بیٹے کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ خانخاناں اور اس کے بیٹے کچھ عرصہ اپنے اس فیصلہ پر قائم رہے اور جب دیکھا کہ باپ کے مقابلہ میں بیٹا کامیاب نہیں ہو سکتا تو وہ باپ سے جا ملے۔ باوجودیکہ شاہجہاں قرآن ہاتھ میں دے کر حلف لیتا ہے اس کے سامنے آہ و زاری کرتا ہے۔ روتا ہے، گڑگڑاتا ہے۔ مگر خانخاناں اس کے باوجود بادشاہ سے مل جاتا ہے اور بیٹے کے خلاف سازشوں میں شریک ہو جاتا ہے۔ خانخاناں کے پاس اس طرز عمل کی حمایت میں کوئی جواز نہیں۔ اسے شاہجہاں کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیئے تھا۔ وہ اپنے کو قسمت کے حوالے کر دیتا اور قدرت کے فیصلے کا انتظار کرتا۔ محض اپنے بیٹوں اور خود اپنی زندگی بچانے کے لیے اس نے یہ اقدام کیا جس سے اس کا وقار بھی طرح مجروح ہوا اور وہ دوست و دشمن دونوں کی نظروں میں گر گیا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ نہ اپنی عزت بچا سکا اور نہ اپنے بیٹے کی زندگی۔ مگر اس واقعہ سے خانخاناں کی عظمت میں فرق نہیں آتا ہے۔ اس کے دوسرے کارنامے تاریخ کے اوراق میں چاند ستاروں کی طرح چمکتے رہیں گے۔

خانخاناں کی سخاوت اور فیاضی کے واقعات ضرب الامثال کی طرح مشہور رہیں جو اس کی سیرت کا درخشندہ و تابناک رخ پیش کرتے ہیں۔ چند قصے یہاں بیان کیے جاتے ہیں۔

- اصفہان کا رہنے والا ایک شاعر ملا شکیبی سندھ کے مقام پر خانخاناں سے آکر ملاقات کرتا ہے۔ ساقی نامہ لکھ کر خانخاناں کی خدمت میں پیش کیا۔ خانخاناں اسے تین ہزار روپے ایک خلعت اور ایک عراقی گھوڑا انعام میں دیا۔ شکیبی حج کے لیے جانے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے زاد راہ کے لیے اسی ہزار روپے دیتا ہے۔ راستہ میں اس

کا مال و اسباب لٹ جاتا ہے تو خانخاناں مزید روپیہ مدد کے لیے بھجدیتا ہے۔ ملا شکیبی جب حج سے واپس آیا تو اس نے ایک عجیب و غریب واقعہ خانخاناں کو سنایا۔ اس نے بتایا کہ جب عدنان کی بندرگاہ پہنچا تو وہاں کچھ لڑکے عربی میں گیت گا رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ اب خانخاناں آگیا ہے تو لڑکیوں کو شوہر مل جائیں گے۔ بازار میں چیزوں کے دام بڑھ جائیں گے۔ باغوں میں پھل آئیں گے۔ پانی سے تالاب بھر جائیں گے۔ لوگوں کی پریشانیاں دور ہوں گی۔ ملا شکیبی کہتے ہیں یہ گیت سُن کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

● شاعر ملا شوقی، خانخاناں کے دربار سے وابستہ تھا۔ ایک دن اس نے بادشاہ سے کہا کہ میں نے کبھی خزانہ (ٹریجزری) نہیں دیکھا۔ خانخاناں نے حکم دیا اسے خزانہ دکھاؤ۔ خزانہ میں لیجا کر اس سے کہا گیا کہ لے جاؤ جس قدر لے جا سکتے ہو۔ ململ کا کُرتہ پہنے تھا۔ جس میں زیادہ روپے نہیں آسکتے تھے۔ خانخاناں نے اسے ایک چادر دی اور کہا اس میں بھر لو۔

● نظیری نیشاپوری ایک مشہور شاعر تھا اور خانخاناں کے دربار میں ملازم تھا۔ ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں وہ ایک بلند رکھتا ہے۔ ہندوستانی تنقید نگاروں نے اس کی شاعری پر بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ وہ نیشاپور سے چلکر آگرہ پہنچا جہاں خانخاناں سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ان ہی دنوں خانخاناں فتح گجرات سے آگرہ لوٹا تھا۔ وہ آگرہ سے احمد آباد چلا گیا جہاں اس نے مستقل سکونت اختیار کی۔ انتقال بھی وہیں ہوا اور اپنی بنوائی ہوئی مسجد میں مدفون ہے۔ ایک مرتبہ نظیری نے خانخاناں سے کہا کہ اس نے ایک لاکھ اشرفیاں ایک جگہ نہیں دیکھی ہیں۔ خانخاناں نے ایک لاکھ اشرفیوں کا ڈھیر لگا دیا۔ نظیری نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ کی بدولت ایک لاکھ اشرفیاں دیکھنا نصیب ہوا۔ خانخاناں نے اشرفیوں کا وہ ڈھیر نظیری کو پیش کر دیا اور کہا ' میرا نہیں اب خدا کا شکر ادا کرو۔

● خانخاناں سپاہیوں کی تنخواہ کے رجسٹر پر دستخط کر رہا تھا۔ ایک سپاہی کے خانہ میں غلطی سے ہزار دام کی بجائے ہزار روپے لکھے گئے۔ دیوان نے غلطی کی طرف توجہ دلائی۔ خانخاناں نے کہا۔ رہنے دو۔ جو لکھا گیا سو لکھا گیا۔ یہ اس کی قسمت کا تھا۔

● ایک مرتبہ خانخاناں ہاتھی پر سوار بازار سے گزر رہا تھا۔ راستہ میں ایک غریب شخص حاضر ہوا۔ ایک شیشی میں چند بوند پانی ڈالکر خانخاناں کو دکھایا اور پھر شیشی کو الٹ دیا۔ جب پانی گرنے کے قریب ہوا تو شیشی کو پھر سیدھا کر دیا۔ خانخاناں نے اسے انعام واکرام دے کر رخصت کیا۔ مصاحبوں نے اس کا مطلب پوچھا۔ جواب دیا۔ وہ آدمی کسی شریف گھرانہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا مطلب تھا چند بوند آبرو بچی ہے پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی گرنے والی ہے۔

● ایک دن خانخاناں گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ کسی نے پتھر پھینک کر مارا۔ سپاہیوں نے مارنے والے کو پکڑ لیا اور سامنے پیش کیا۔ حکم ملا۔ ایک ہزار اشرفیاں اسے دیدی جائیں۔ سب حیران کہ جو سزا کا مستحق تھا اسے انعام دیا جا رہا ہے۔ پوچھنے پر خانخاناں نے جواب دیا۔ لوگ پھلدار درخت پر پتھر مارتے ہیں۔ اس نے مجھے پھلدار درخت سمجھا۔ میرا جو پھل ہے وہ اسے دینا مناسب ہے۔

● خانخاناں مداحوں کے بیچ گھرا ہوا بیٹھا تھا۔ ایک معمولی آدمی بھی وہاں آکر بیٹھ گیا اور دھیرے دھیرے اپنی جگہ بناتا ہوا خانخاناں کے قریب پہنچ گیا۔ چپکے سے لوہے کا ایک وزنی گولہ خانخاناں کی طرف لڑھکایا۔ نوکر اسے پکڑنے کے لیے اس کی طرف دوڑے۔ خانخاناں نے منع کیا اور کہا کہ لوہے کے برابر سونا اسے دیدو۔ مصاحبوں نے حیرانی سے پوچھا ایسا کیوں۔ جواب میں خانخاناں نے یہ شعر پڑھا۔

آہن کہ بپارس آشنا شد

فی الحال بہ صورت طلا شد

(لوہا کسوٹی سے چھوتا ہے تو سونا ہو جاتا ہے)

● اس زمانہ میں بادشاہ اور اُمرا جدت طرازی کی قدر کرتے تھے۔ ذہانت اور حاضر جوابی کا انعام ملتا تھا۔ اہل علم کے پاس اہل دولت تک پہنچنے کے یہ ذریعے تھے۔ ایک غریب برہمن خانخاناں کے دروازے پر آیا۔ دربان نے روکا۔ برہمن نے کہا کہ دربان سے جاکر کہو کہ اس کا ہم زلف ملنے آیا ہے۔ خانخاناں نے برہمن کو اندر بلالیا اور پوچھا کبھی یہ ہم زلف کا رشتہ کیا ہے۔ برہمن نے جواب دیا۔ بپتا (ناداری) اور سمپتا (دولت)

دو سگی بہنیں ہیں۔ پہلی میرے گھر آئی اور دوسری کو خانخاناں بیاہ لایا۔ اس طرح دونوں آپس میں ہم زلف ہوتے۔ خانخاناں یہ سن کر لطف اندوز ہوا اور برہمن کو بہت سا روپیہ دے کر رخصت کیا۔

● جہانگیر تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا۔ خانخاناں بھی ساتھ تھا۔ ایک بھاٹ برابر جملے بازی کر رہا تھا۔ مقصد بادشاہ کا التفات حاصل کرنا تھا۔ مگر اس کی بیجا حرکتوں کی وجہ سے بادشاہ کو غصہ آگیا۔ جہانگیر نے حکم دیا۔ بھاٹ کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے پھینک دیا جاتے۔ بھاٹ رونے چلاّنے لگا۔ اور بولا۔ "حضور! میں ایک معمولی آدمی۔ ہاتھی کیا کرے گا۔ میرے لیے تو چڑیے یا چوہے کا پاؤں کافی ہے۔ ہاتھی کا پاؤں تو خانخاناں جیسے بڑے آدمی کے لیے چاہیئے۔" بھاٹ کی دلچسپ بات سن کر بادشاہ زیر لب مسکرایا اور اس نے سوالیہ نگاہوں سے خانخاناں کی طرف دیکھا۔ خانخاناں کچھ دیر کے لیے اُلجھن میں پڑگیا۔ سوچ کر جواب دیا۔ "اگر بادشاہ سلامت بھاٹ کی خطا معاف کر دیتے ہیں تو اسے میری طرف سے پانچ ہزار روپیہ انعام میں دیدیا جاتے۔ اس لیے کہ وہ مجھے بڑا آدمی سمجھتا ہے۔" بادشاہ اس جواب سے خوش ہوا اور بھاٹ کو معاف کر دیا۔ خانخاناں نے بھاٹ کو پانچ ہزار روپیہ انعام میں دیدیے۔

● ایک مرتبہ خانخاناں کو ایک مصوّر نے ایک تصویر پیش کی جس میں ایک عورت نہا کر کرُسی پر بیٹھی ہے اور بالوں کو سنوار رہی ہے۔ ایک باندی اس کے پاؤں دُھلا رہی ہے۔ خانخاناں نے تصویر دیکھی اور مصور کو پانچ ہزار روپیہ انعام میں دینے کا حکم دیا۔ مصوّر نے کہا کہ انعام تو اس وقت لوں گا جب حضور یہ فرمائیں گے کہ اس تصویر میں وہ کون سی خوبی ہے جس کی وجہ سے تصویر انعام کی مستحق قرار پائی۔ خانخاناں نے کہا کہ اس عورت کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ ہے جو پاؤں میں گدگدی کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے۔ مصوّر نے تسلیم کیا اور سمجھ گیا کہ خانخاناں کو اچھے آرٹ کی پرکھ ہے جو اس کا مقصد بھی تھا۔ اس نے انعام قبول کر لیا۔

● خانخاناں دربار کو جا رہا تھا۔ ایک سوار۔ سپاہگری کے ہتھیاروں سے آراستہ عجیب و غریب ہیئت بناتے سامنے آیا۔ اس کی پگڑی میں دو میخیں بندھی ہوتی تھیں۔ خانخاناں نے پوچھا کیا چاہتے ہو۔ اس نے جواب دیا۔ نوکری۔ خانخاناں نے پھر پوچھا

ان میخوں کا کیا مطلب ہے۔ اس نے عرض کیا۔ ایک اس کے واسطے ہے جو نوکر رکھے اور تنخواہ نہ دے اور دوسری میخ اس نوکر کے واسطے ہے جو تنخواہ لے اور کام نہ کرے خانخاناں خوش ہوا اور اسے اپنے ساتھ دربار میں لایا اور اس سے سوال کیا۔ ایک انسان کی عمر طبعی کتنی ہوتی ہے۔ اس نے کہا ایک سو بیس برس۔ خانخاناں نے اس کی عمر بھر کی تنخواہ اسے پیشگی دیدی اور کہا حضرت اب ایک میخ تو پگڑی سے نکال دیجئے۔ دوسری میخ کا اختیار خود آپ کو ہے۔

● خانخاناں کو دعوتیں کرنے کا بڑا شوق تھا۔ انواع واقسام کے کھانے دسترخوان پر سجے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی رکابیوں کے نیچے اشرفیاں بھی رکھ دیتا تھا کہ جس کا جو نصیب۔ ایک بار کھانے کی ایسی ہی محفل آراستہ تھی۔ ایک ملازم جو نیا نیا ملازمت میں رکھا گیا تھا اچانک رونے لگا۔ خانخاناں نے رونے کا سبب پوچھا۔ نوکر نے جواب دیا۔ میرے والد کو بھی دعوتیں کرنے کا شوق تھا اور اسی طرح محفل آراستہ کیا کرتا تھا۔ یہ محفل دیکھ کر مجھے اپنے والد کی یاد آگئی۔ خانخاناں کو بھی دکھ ہوا۔ ایک بھنا مرغ سامنے رکھا تھا۔ اس سے پوچھا اچھا بتاؤ مرغ میں سب سے زیادہ لذیذ کونسی چیز ہوتی ہے۔ نوکر نے جواب دیا۔ پوست یعنی کھال۔ خانخاناں کو یقین ہو گیا کہ واقعی یہ خاندانی آدمی ہے اور سچ بولتا ہے۔ اسے اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھایا۔

● ایک مرتبہ خانخاناں دربار شاہی سے برہان پور جاتے تھے۔ راستہ میں خیمہ زن ہوئے شام کو خیمہ کے باہر محفل آراستہ ہوئی۔ مصاحب اور امرا چاروں طرف جمع تھے۔ ایک درویش ادھر سے گزرا۔ اس نے خانخاناں کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر صدا بلند کی اور یہ شعر پڑھا۔

منعم بکوہ ودشت وبیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت وخیمہ زد وبارگاہ ساخت

(جنگل ہو کہ بیاباں دولت مند لوگ ہر جگہ امیر ہی ہوتے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں جنگل میں منگل کا سماں پیدا ہو جاتا ہے)

خانخاناں کو یہ شعر پسند آیا۔ اس لیے بھی کہ اکثر لوگ خانخاناں کو منعم کے نام سے بھی پکارتے تھے۔ حکم دیا کہ درویش کو ایک لاکھ روپیہ دیدو۔ دوسرے دن وہ فقیر پھر وہاں سے

گزرا اور یہی شعر پڑھا۔ خانخاناں نے پھر ایک لاکھ روپیہ دیدیا۔ سات دن تک وہ برابر آتا رہا اور خانخاناں اسے ایک لاکھ روپیہ دیتا رہا۔ آٹھویں دن وہ نہیں آیا۔ سوچا ہوگا کہ معلوم نہیں کیا ہو۔ ہوسکتا ہے امیر دیا ہوا روپیہ واپس لے لے۔ اس لیے آٹھویں دن وہ نہیں آیا۔ خانخاناں خیمہ کے باہر کرسی بچھاتے دیر تک درویش کا انتظار کرتا رہا۔ جب ناامید ہوگیا تو درباریوں سے بولا۔ "آگرہ سے برہان پور ۲۷ منزل ہے۔ میں نے ۲۷ لاکھ روپے خزانہ سے مہیا کر دیے تھے اب اس کا نصیب۔ پست حوصلہ تھا۔ اتنے پر ہی قناعت کر گیا۔

خانخاناں کی سیرت و شخصیت کے اور بھی پہلو ہیں۔ علم و ادب اور تصوّف سے اس کی دلچسپی اس کی بنائی ہوئی عمارتیں، باغات، سرائے، تالاب اور خاص طور پر حضرت شیخ احمد سرہندی سے اس کی مراسلت اس کی شخصیت کے کئی نامعلوم گوشوں پر سے پردہ اٹھاتے ہیں جن کا ذکر ہم نے علاحدہ ابواب میں کیا ہے۔

(۱۰)

علم وادب اور تصوف

I علم وادب

ایک مرتبہ عرب کے ایک عالم کے چند خطوط اکبر کے نام آئے جو حجازی بولی میں لکھے ہوئے تھے اور جسے عرب بھی مشکل سے سمجھتے تھے۔ یہ خطوط دربار کے اہل علم میں سے کوئی بھی نہ پڑھ سکا۔ ابوالفضل اور ابوالفتح گیلانی تک نہ پڑھ سکے۔ خانخاناں کو جب وہ خطوط دے گئے تو اس نے ایک ایک لفظ کا ترجمہ کر دیا اور بے ساختہ خطوں کا مضمون فارسی میں سنا دیا۔

خراسان کے لیے سفیر بھیجا جا رہا تھا۔ اکبر کے حکم سے خانخاں نے خراسان کے بادشاہ کے نام خط کا مسودہ تیار کیا۔ بادشاہ کی منظوری سے پہلے یہ مسودہ اصلاح کی غرض سے کئی علما کو دکھایا گیا مگر کوئی بھی اس میں ایک لفظ گھٹا بڑھا نہیں سکا۔ بلکہ سب نے مسودہ کی تعریف کی اور کہا کہ پوری سلطنت میں کوئی ایسا منشی نہیں جو اس طرح کا مدبرانہ خط لکھ سکتا ہو۔ جب خط بادشاہ کے سامنے پیش ہوا تو اس نے بھی پسند کیا اور جب خراسان کے دربار میں پڑھ کر سنایا گیا تو وہاں بھی خط کی بڑی تعریف ہوئی۔ کہتے ہیں سرکاری خطوں کے مسودہ تیار کرنے میں خانخاناں کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔

خانخاناں کے گھر پر ادبی و علمی نشستوں و محفلوں کا اہتمام ہوتا تھا۔ یہی محفلیں ہمارے آج کے مشاعروں کا پیش رو تھیں۔ بعض اوقات مصرع طرح بھی دیا جاتا تھا۔ ایک بار غزل کا مصرع طرح دیا گیا جس کا قافیہ چنداست، پنداست، فرزنداست تھا۔ خانخاناں نے بھی اس طرح میں غزل لکھی اور پڑھ کر سنائی اور جو پسند کی گئی۔ خانخاناں کی غزل کے دو شعر

ملاحظہ کیجیے ؎

شمارِ شوق ندانستہ ام کہ تا چند است	جز ایں کہ دلم سخت آرزومند است
بہ کیشِ صدق و صفا حرفِ عہد بیگانہ است	نگاہِ اہلِ محبت تمام سوگند است

خانخانان عربی، ترکی، فارسی اور ہندی زبانیں تو جانتا ہی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے سندھی زبان بھی آتی تھی اور اکبر کے حکم سے اس نے پورپی زبانیں بھی سیکھنا شروع کیا تھا۔ انگریزوں اور ولندیزیوں سے اس کے تعلقات تھے اور کئی معروف سیاح اس سے ملے بھی تھے۔ سورت جو یورپی قوموں کا مرکز تھا بہت عرصہ تک خانخاناں کے زیر انتظام رہا۔ اس لیے ضروری ہے کہ یورپی زبان میں کچھ شد بد پیدا ہو گئی ہوگی۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اس کی ترکی دانی پر گرفت کی ہے اور لکھا ہے کہ اپنے ملازموں سے ترجمہ کرا کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ اگرچہ ترجمہ نگرانی میں بھی کرایا گیا تب بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خانخاناں ترکی زبان سے بابلد تھا۔ کسی کام کی نگرانی کے لیے بھی ضروری ہے کہ آدمی اس کام کو خود بھی پوری طرح جانتا ہو۔

شبلی نعمانی نے خانخاناں کے بارے میں لکھا ہے :۔

"وہ امرائے اکبری کا گل سبد تھا، اس زمانہ میں وہی ایک شخص تھا جس کے تاج فخر پر صاحب السیف و قلم کا طرہ زیب دیتا تھا...... وہ شاعری میں پڑتا تو عرفی اور نظیری کا ہم سر ہوتا۔ خانخاناں کی فیاضی اور قدردانی سے جو شعرا اور اہل کمال اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے سلاطین کو بھی یہ بات نصیب نہ ہوئی۔ ان کی شاہانہ فیاضیوں اور شاعرانہ نکتہ سنجیوں نے شعر و شاعری کے حق میں ابر کرم کا کام کیا۔"

علم و ادب سے خانخاناں کی وابستگی کا علم مآثر رحیمی سے ہوتا ہے۔ یہ اس کی سوانح ہے جسے اس کی فرمائش پر عبدالباقی نہاوندی نے تصنیف کیا۔ یہ سوانح خانخاناں کی حیات میں ۱۶۱۶ء میں مکمل ہو گئی تھی۔ یہ تین جلدوں پر مشتمل اور تین ہزار سے زائد صفحوں پر محیط ہے اس کا ایک مستند اور اولین اڈیشن ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے شائع کیا تھا۔ مآثر رحیمی خانخاناں سے زیادہ معاصر شعرا فضلا اور حکما کا تذکرہ ہے۔ ایک سو سات شعرا کا ذکر اور انکا انتخاب کلام مآثر میں دیا گیا ہے جو خانخاناں کے دربار سے وابستہ تھے۔ نہاوندی نے خانخاناں کے ایک فارسی کے دیوان کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر دیوان

ابھی تک کہیں دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔اس کے محاسن کلام کا اندازہ انہیں غزلوں، رباعیوں سے ہوتا ہے جو مآثر رحیمی میں درج ہیں۔

عبدالباقی نہاوندی کا باپ شاہ ایران عباس صفوی کے امرامیں شامل تھا۔ ہمدان کے قریب مقام نہاوند کا رہنے والا تھا۔ باپ پر عتاب نازل ہوا، اور خاندان پر برے دن آئے تو عبدالباقی نے ہندوستان کا رخ کیا۔ عبدالباقی نہاوندی پہلے سے خانخانان سے واقف تھا۔اس نے خانخاناں کی تعریف میں کئی قصیدے لکھ کر روانہ کئے تھے اس لئے وہ سیدھا ایران سے چل کر خانخاناں کی خدمت میں پہونچا اور اسے سوانح لکھنے پر مامور کیا گیا۔ جس طرح اکبرنامہ اور آئین اکبری لکھ کر ابوالفضل نے اکبر کی زندگی کو دوام بخشا اسی طرح عبدالباقی نہاوندی نے مآثر رحیمی لکھ کر عبدالرحیم خانخاناں کو زندہ جاوید بنادیا۔

مآثر رحیمی خانخاناں کی سوانح سے زیادہ ہم عصر عہد کی تاریخ ہے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ معاصر علما و شعرا کا تذکرہ ہے۔ اور اس میں زیادہ تر انہیں اہل کمال کا ذکر ہے جو خانخاناں کے دربار سے وابستہ تھے، خانخاناں کے خاندانی حالات، غزنویوں، سلاطین بنگال اور شرقی سلاطین، مالوہ و مانڈو، کشمیر و سندھ اور گجرات کے فرمانرواؤں کے حالات، اس کے بعد بابر سے لیکر جہانگیر تک کے حالات زندگی اس کتاب میں ملتے ہیں۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے ایک سو سات شعرا خانخاناں سے وابستہ تھے وہ باقاعدہ اس کی ملازمت میں تھے اور جنھیں خزانے سے تنخواہ ملتی تھی یا انہیں جاگیریں عطا ہوتی تھیں اطبا و حکما اور علما ان کے علاوہ تھے وہ بھی وظیفہ خور تھے۔ صرف چند شعرا کا ذکر یہاں کرتے ہیں جو اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے اس عہد میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔

عرفی شیرازی کا نام سب سے اہم ہے۔ وہ شاعری میں بھی بلند مقام رکھتا تھا، ایران اور ہندوستان میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہاں کے شرفاء میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ خود پرست اور مغرور بھی تھا۔ مصوری کا شوق رکھتا تھا۔ اس کے ہندوستان آنے کی وجہ جذبہ عشق بتایا جاتا ہے، وہ شہزادہ سلیم پر غائبانہ عاشق ہوگیا تھا۔ شہزادہ کے حسن و جمال کے قصے سنے تھے۔ شاید کوئی تصویر بھی دیکھی ہو۔ وہ اپنے معشوق سے ملنے کے لئے ہندوستان آیا تھا۔ معشوق بھی کون؟ ہندوستان کا ولیعہد اور ہونے والا بادشاہ۔ ابتدا میں اس نے فیضی کی ملازمت اختیار کی مگر اس کے ساتھ زیادہ دن نبھ نہ سکی۔ بقول

ملا بدایونی فیضی کے ساتھ کوئی بھی شخص زیادہ دن نبھا نہیں سکتا تھا۔ بہرحال اس کے بعد عرفی نے ابوالفتح گیلانی کی ملازمت اختیار کرلی جس کا شمار اکبر کے نورتنوں میں ہوتا تھا اور وہ بھی داد و دہش میں خانخاناں سے کم نہ تھا۔ اس کے ساتھ بھی زیادہ دن گذارا نہیں ہوسکا۔ آخر میں وہ خانخاناں کے دربار سے وابستہ ہوگیا اور عمر بھر اسی کے ساتھ رہا۔ خانخاناں کی سرپرستی نے اسے مالی پریشانیوں سے آزاد کردیا تھا جس کی وجہ سے اس کی شاعری میں نکھار اور جلا پیدا ہوئی۔ وہ تھا بھی باکمال شاعر اسی لئے لوگ اس کے نخرے برداشت کرتے تھے۔

شہزادہ سلیم نے اسے دربار میں بلایا۔ وہ جانتا تھا کہ عرفی میرا عاشق ہے۔ شاعر قصیدہ لکھ کر دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ مراد پوری ہوتی ہے۔ سراپا اشتیاق ہے۔ دربار میں پہنچ کر شہزادہ کے سامنے زمین بوس ہوتا ہے۔ نگاہ رخ جمال پر پڑتی ہے۔ عجیب کیفیت ہے۔ ان کیفیات کو قصیدہ میں موتیوں کی طرح پرو کر لیجاتا ہے۔ نہایت لطیف پیرائے میں کہتا ہے کہ اگر میں ادب سے رک نہ جاتا تو بجائے اس کے کہ میرے لب اس کے قدم چومتے۔ اس کے قدم میرے لب چوم لیتے۔ عرفی اس ملاقات کا حال اسی طرح بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ ہر شعر میں ایک سچے عاشق کی وارفتگی ہے۔ سوال یہ ہے کہ محبوب اور ممدوح دونوں ایک ہی شخص ہے۔ پھر شاعر بھی خودی اور پندار کی زنجیروں میں جکڑا ہے۔ خود اپنے وقار کو بھی برقرار رکھتا ہے اور اظہار عشق بھی اس پیرایہ میں کرتا ہے کہ شہزادہ کو ناگوار نہ گذرے۔ بعض مقامات پر اظہار بہت نمایاں ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے۔

"باوجودیکہ شہزادہ نے کچھ نہیں کہا اور میں نے سب کچھ سن لیا۔ اس کی نگاہ میں ساری تقریر تھی۔ اورجب آخر کار بات نگاہ سے گذر کر لبوں تک پہنچی تو میرے کان کوثر و تسنیم کے رس میں ڈوب گئے۔"

شیخ سعدی نے ایک قطعہ لکھا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ اس شاعر کو عاشقی کا نام نہیں لینا چاہیے جو قصیدہ میں دو چار عشقیہ شعر لکھ کر عاشقی کا دعوی کرتا ہے۔ عرفی نے ایک طرح سے اس قطعہ کا جواب لکھا ہے جس میں شہزادہ سلیم کے تئیں اپنے عشق کی طرف بڑا لطیف اشارہ کیا ہے وہ لکھتا ہے۔ "سعدی گو ممدوح کو معشوق پر ترجیح نہیں دیتے۔ ٹھیک ہے ان کا معشوق اور ہے اور ممدوح اور۔ لیکن میری مشکل تو یہ ہے کہ میرا ممدوح بھی وہی ہے جو میرا معشوق ہے"

عرفی کی بدمزاجی کیوجہ سے لوگ اس سے ناراض رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ذاتی دشمنی کی وجہ سے کسی نے اسے زہر دلا کر ہلاک کردیا۔ لاہور میں دفنایا گیا۔ بعد میں اس کی ہڈیوں کو

قبر سے نکال کر نجف لیجا کر دفنایا گیا کیوں کہ وہ شیعہ تھا۔

ایک دوسرا قابل ذکر شاعر جس کا خانخاناں سے تعلق رہا نظیری نیشاپوری تھا وہ اپنے زمانہ کا ممتاز شاعر تھا۔ خراسان میں جب اس نے اپنی شاعری کا لوہا منوالیا تو اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ اصل وجہ تو خانخاناں کی فیاضی اور شاعروں کی سرپرستی کا شہرہ تھا جو دوسرے شاعروں کی طرح اسے بھی ہندوستان کھینچ لایا تھا۔ خانخاناں کے کیریر کے ابتدائی زمانہ میں جب وہ گجرات کی مہم کو فتح کر کے آگرہ لوٹا تھا نظیری اس سے آکر ملا اور قصیدہ پیش کیا۔ اس وقت رحیم کو خانخاناں کا خطاب ملا تھا جس کا ذکر اس نے اپنے قصیدہ میں کیا ہے۔ خانخاناں کے توسط سے ہی وہ اکبر کے دربار تک پہنچا مگر وہاں اسے زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔ اس لیے اپنا تعلق خانخاناں سے رکھا۔ اس نے احمد آباد میں سکونت اختیار کرلی۔ اس نے سفر حج کیا جس کے تمام اخراجات خانخاناں نے برداشت کیے۔ حج سے واپسی پر اس کا تعلق شہزادہ مراد سے ہوگیا۔ شہزادہ مراد دکن کی مہم پر جا رہا تھا کہ گھومتا پھرتا نظیری بھی وہاں پہونچ گیا۔ اس کے کچھ قدردانوں نے اسے مراد کے سامنے پیش کیا۔ جشن نو روز منایا جارہا تھا۔ دربار سجا تھا۔ وہاں کی آن بان کو دیکھ کر نظیری کے ہوش اڑ گئے اور وہ سجدہ کرنا بھی بھول گیا۔ جہانگیر سے بھی اس کا تعلق رہا اور اس کی شان میں قصیدے لکھے۔ وہ پیشہ کے اعتبار سے سنار تھا اور تجارت کرتا اور امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا امرا میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ آخیر عمر میں وہ دینی علوم کی طرف مائل ہوا۔ وہ خانخاناں کے ساتھ دکن کی مہم پر جا رہا تھا جہاں مانڈو میں اس کی ملاقات شیخ غوثی مانڈوی سے ہوئی جس سے اس نے عربی زبان سیکھی اور حدیث و تفسیر پڑھی۔ وہ اکبر کے مذہبی خیالات کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اخیر عمر میں تارک الدنیا ہوگیا تھا۔ مگر بڑھاپے میں احمد آباد سے آگرہ تک سفر کیا۔ جس کا مقصد اپنا دیوان خانخانان کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔ وہ تمباکو نوشی کا عادی تھا اگرچہ جہانگیر نے تمباکو پر پابندی عائد کردی تھی مگر وہ پھر بھی پیتا تھا۔ اس نے تمباکو کی تعریف میں ایک غزل بھی لکھی۔ احمد آباد میں وفات پائی۔ اپنے مکان کے قریب ایک مسجد تعمیر کرائی تھی اسی میں دفن ہوا۔ نظیری کی قبر جس محلہ میں تھی اس کا نام تاجپورہ تھا۔ قبر پر ایک گنبد بھی بنا ہوا تھا۔

وہ اگرچہ مختلف درباروں سے وابستہ رہا مگر اس نے زیادہ تر قصیدے خانخاناں

کی شان ہی میں لکھے، خان اعظم کی تعریف میں بھی ایک قصیدہ لکھا۔ ہم عصر شعرا جیسے عرفی، شکیبی، انیس وغیرہ سے معرکے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ خانخاناں نے انیس کو ایک خط لکھا جس کے حاشیہ میں نظیری کو بھی سلام لکھا۔ نظیری کو ناگوار گذرا اور ایک قصیدہ میں خانخاناں کو اس کی شکایت لکھی۔

ایک اور شاعر خانخاناں کے تعلق سے جس کا ذکر اکثر آتا ہے مولانا شکیبی ہے۔ وہ اصفہان کا رہنے والا تھا۔ عالم و فاضل ہونے کے ساتھ اچھا شاعر بھی تھا۔ سندھ میں خانخاناں سے آکر ملا اور خراج تحسین پیش کیا۔ ساقی نامہ لکھ کر پیش کیا۔ خانخاناں نے بارہ ہزار روپے۔ ایک خلعت اور ایک گھوڑا انعام میں دیے۔ حج پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اسی ہزار اخراجات کے لیے مرحمت فرمائے۔ اخیر عمر میں وہ جہاں گیر سے وابستہ ہوگیا اور آگرہ میں انتقال ہوا۔

مولانا مظہری کشمیری بھی خانخاناں کے خوشہ چین تھے۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جو ایران، عراق اور خراسان کے لئے سیاحت کے لئے نکلے، اور ان ممالک میں اپنی شاعری کی داد حاصل کی۔ مآثر رحیمی کے مطابق اب تک ایسی مثال نہیں ملتی کہ ہندوستانی شاعر باہر جاکر اپنی شاعری کا سکہ جمائے یہ عزت مظہری کو حاصل ہوئی۔ سیر و سیاحت کے بعد ہندوستان آکر اکبر کی ملازمت اختیار کی۔ نعت گوئی میں خاص شہرت حاصل ہوئی خانخاناں سے وابستہ رہے اور اس کی تعریف میں متعدد قصیدے لکھے۔ اخیر میں کشمیر میں گوشہ نشین ہوگئے اور وہیں انتقال ہوا۔

ہم نے ان چند شعرا کا ذکر کیا جن کا شہرہ تھا اور جو درباروں کی زندگی میں زیادہ دخیل تھے۔ یہ فہرست تو بہت طویل ہے، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ایک سو سات شعرا خانخاناں سے وابستہ تھے۔ اطبا و حکما اور علما ان کے علاوہ تھے۔ خواجہ حسین ثنائی تھے جو ایران سے اس لئے بھاگ آئے تھے کہ ایک قصیدہ جو اس نے شاہ ایران کی شان میں لکھا تھا اس میں بادشاہ کا نام نہیں تھا، وہ اکبر بادشاہ اور حکیم ابوالفتح سے وابستہ رہا بعد میں خانخاناں اس کا مربی بن گیا۔ وہ زیادہ ترقی نہیں کرسکا کیونکہ اس میں جلن اور حسد بہت تھا۔ مولانا محتشم کاشانی بھی ایران کا درباری شاعر تھا اور ناقدری کی وجہ سے ہندوستان چلا آیا تھا۔ ان کے علاوہ ظہوری، مولانا ملک

ملہی شیرازی۔ حیدر رفیعی۔ محب علی سندی۔ اسماعیل بیگ انسیؔ۔ نوعی خراسانی۔ مولانا تقیا وی شوستری۔ حیاتی گیلانی۔ باقر کاشانی وغیرہ وغیرہ شعرا تھے جو خانخاناں کی سرپرستی اور فیاضی میں پروان چڑھے۔

دراصل تعریف اور بے جا خوشامد اس زمانہ کا مزاج تھا۔ شاعری بھی بال کی کھال نکالنے کے مترادف تھی۔ معنی آفرینی تخیل آرائی۔ بے بات سے بات پیدا کرنا۔ ترکیب و محاورے۔ صنائع و بدائع کی کثرت سے زبان کو بوجھل بنانا۔ سبھی شعرا میں ایک جیسی خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ یکسانیت اس زمانے کی عام خصوصیت تھی چند شعرا مستثنیٰ ضرور تھے۔ مگر یہ عام چلن تھا۔ ہر شاعر قصیدہ خوانی ضرور کرتا تھا۔ انھیں اسی کام کے لیے روپیہ اور انعام و اکرام ملتا تھا۔ اس کی وجہ سے جھوٹی تعریف اور بے جا خوشامد جیسی برائیاں مزاج کا حصہ بن گئیں۔ ان میں سے زیادہ تر اہل قلم ایران۔ عراق اور خراسان سے ہندوستان آئے تھے۔ ان میں سے کچھ آزاد پیشوں سے بھی وابستہ تھے۔ کچھ نے سپہ گری کو پیشہ بنالیا تھا۔ مگر زیادہ تر سرکاری خزانہ سے تنخواہ پاتے تھے۔ بعض کو شہزادے یا امرا یا بادشاہ اتنی جاگیر دیدیے تھے کہ انھیں پھر کچھ کرنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ بلاشبہ ان کی سرپرستی سے ہندوستان میں فارسی زبان وادب کو فروغ حاصل ہوا مگر معاشرہ میں بہت سی برائیاں بھی راہ پاگئیں جو آگے چلکر اردو زبان وادب کو ورثہ میں ملیں اور آج بھی ہمارے مزاج کا حصہ ہیں۔

مغلوں کو کتابوں کے مطالعہ سے خاص دلچسپی تھی۔ ان کے اپنے ذاتی کتب خانے تھے ہمایوں نے شیرشاہ کے بنوائے قلعہ پرانا قلعہ میں ایک لائبریری قائم کی تھی جس کی سیڑھیوں سے گر کر اس کی موت ہوئی۔ گجرات کی مہم کے دوران ہمایوں کیمبے کے مقام پر خیمہ زن تھا کہ کچھ پہاڑی قبیلوں نے اس کے کیمپ کو تاراج کردیا۔ خیمہ میں کچھ نادر کتب بھی تھیں۔ جو قبائلی لے گئے تھے اور جس کا بادشاہ کو بڑا دکھ ہوا وہ یہ کتابیں ہر وقت مطالعہ میں رکھتا تھا۔ اکبر کو بھی کتابوں سے گہری دلچسپی تھی۔ اس کے کتب خانے میں چوبیس ہزار کتابیں اور مخطوط تھے۔ مغل نہ صرف یہ کہ کتابوں سے شوق رکھتے تھے۔ انھیں عوام کے لیے کتب خانے کھولنے اور ریڈنگ روم بنانے سے بھی دلچسپی تھی۔ عبدالرحیم خانخاناں نے احمدآباد میں دارالحکمت قائم کرکے ایک اہم قدم اٹھایا۔

خانخاناں نے یہ ادارہ ذاتی کتب خانے کے طور پر قائم کیا تھا دھیرے دھیرے اس کتب خانہ کی شہرت ساری علمی دنیا میں پھیل گئی۔ اس کتب خانے میں ہر فن کی نادر کتب جمع کی جاتی تھیں زیادہ تر کتب خود مصنفین کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوتی تھیں۔ ہر شاعر کی یہ خواہش رہتی تھی کہ کسی طرح ان کا دیوان اس کتب خانے کی زینت بن جائے۔ عرفی نے بڑھاپے میں خانخاناں سے درخواست کی کہ وہ اس کے کلام کو مرتب کر کے کتب خانے میں جمع کر دے کیوں کہ وہ خود اس قابل نہیں تھا کہ یہ کام کر سکے۔

خانخاناں سے جتنے شعرا وابستہ تھے ان کے دیوان ان کے ہاتھ سے لکھے ہوئے کتب خانہ میں موجود تھے۔ یہ صرف کتب خانہ ہی نہ تھا بلکہ شعر و شاعری کا مرکز تھا۔ یہاں محفلیں آراستہ کی جاتی تھیں۔ مشاعرے ہوتے تھے۔ طرحیں دی جاتی تھیں، جن پر شعرا غزلیں لکھ کر سناتے تھے۔ خود خانخاناں ان ادبی نشستوں میں حصہ لیتا۔

کتب خانہ میں ایک سو سے زائد ملازم کام کرتے تھے۔ کتابوں کی نگرانی کے علاوہ یہاں کتابت کا کام بھی ہوتا تھا۔ مسودوں کو مصوّر کیا جاتا۔ ان کی جلد بندی کی جاتی۔ مرقعے تیار ہوتے تھے۔ کتابوں کی لوح پر طلا کاری کا کام کیا جاتا۔ یہاں کام کرنے والے اہل فن کو زریں رقم۔ عنبریں قلم۔ روشن رقم۔ شیریں رقم۔ مشکل رقم وغیرہ جیسے خطابات سے نوازا جاتا۔

اولاً یہ کتب خانہ سرونج مالوہ کے مقام پر تھا۔ آقا محمد شیرازی اسوقت کتب خانہ کا داروغہ تھا۔ بعد میں اسے احمد آباد لایا گیا۔ اس لائبریری کا قیام ۱۵۸۳ء کے آس پاس عمل میں آیا تھا۔ ملا محمد حسین ہروائی ۳۵ سال تک لائبریری کا ملازم رہا۔ مولانا ابراہیم نقاش کتب خانہ کا ناظم یا معتمد تھا۔ میر باقی ماوراالنہری ترقی کرتے کرتے داروغہ یعنی لائبریرین کے عہدہ تک پہونچا برج بھاشا کا مشہور شاعر شیخ برہمی بہرائچی بھی کتب خانہ میں ملازم تھا۔ وہ بھی ترقی کر کے داروغہ بنا۔ جب وہ ہندوستان چھوڑ کر جانے لگا تو اس نے اپنے بیٹے عبدالسلام کو خانخاناں کی سرپرستی میں دیدیا۔ بڑا ہونے پر اسے بھی کتب خانہ کا داروغہ مقرر کیا گیا۔

شجاع ہرات کا رہنے والا تھا۔ وہ نسخ اور ثلث خطوں میں ماہر تھا۔ خانخاناں سے ٹھٹھہ کے مقام پر ملا تھا۔ وہ بھی کتب خانہ میں ملازم تھا اور ترقی کر کے داروغہ

کے عہدہ تک پہنچا۔ ملا عبد الرحیم ہرات سے آیا تھا۔ وہ نسخ اور نستعلیق کا ماہر تھا۔ وہ بھی کتب خانہ میں ملازم تھا۔ خطاط اور کاتب مسودوں کے نقل کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے جلد ساز۔ مصور۔ کاغذ تراش اور مقابلہ نویس بھی ملازم تھے۔ مسودوں کو طرح طرح لکھا جاتا اور سجایا جاتا تھا۔ کتب خانہ کا مشہور ملازم محمد امین خراسانی تھا جو ... سازی کا ماہر تھا۔ وہ مشہد کی ایک لائبریری میں کام کر چکا تھا۔ ہندوستان میں خانخاناں نے اسے کتب خانہ میں ملازم رکھا اور چار ہزار روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی۔ وہ ابری کا موجد تھا۔ مانڈا نام کا ایک ہندو بھی ملازم تھا جو مصور تھا۔ اس کے علاوہ مادھو۔ فہیم، ندیم، مشفق بہبود وغیرہ بہت سے آرٹسٹ یہاں کام کرتے تھے۔ بہت سے مترجم بھی ملازم تھے۔ اور بعض اہل قلم تصنیف و تالیف کے لیے بھی مقرر تھے۔ مولانا صوفی اپنے زمانہ کا عالم اسی کام پر متعین تھا۔

آخر اس کتب خانہ کا انجام کیا ہوا؟ ظاہر ہے انقلابات زمانہ کے ہاتھوں برباد ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں زیادہ تباہی ہوئی۔ بہت سے مخطوطے انگریز لے گئے۔ اسکے باوجود اس کتب خانہ کے نوادرات آج بھی ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر رامپور لائبریری۔ پٹنہ کی خدابخش لائبریری۔ حیدر آباد کے کتب خانوں۔ بانکی پور کی پبلک لائبریری اور کلکتہ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں بہت سے نوادرات محفوظ ہیں۔

فارسی شاعری کے نمونے

شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چند است

جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومند است

مجھے نہیں معلوم کہ شوق کیا اور کتنا ہے بجز اس کے کہ میرا دل اس کا بہت آرزومند ہے

بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیگانہ است

نگاہ اہل محبت تمام سوگند است

اہل صدق و صفا کے مذہب میں عہد کا لفظ ایک اجنبی لفظ ہے۔ فی الواقع اہل محبت

کی نظر سوگند ہوتی ہے۔

بہ دوستی کہ بجز دوستی نمی دانم
خدائے داند و آں کو مرا خداوند است

دوستی کو میں بجز دوستی کے اور کچھ نہیں جانتا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ وہی میرا مالک و آقا ہے۔

ادائے حق محبت عنایتے است ز دوست
وگرنہ خاطر عاشق بہ ہیچ خرسند است

اگر دوست حق محبت ادا کرے تو یہ اس کی عنایت ہے ورنہ عاشق کا دل تو تھوڑے میں بھی خوش رہتا ہے۔

خیال آفت جان و خواب دشمن چشم
بلائے نیم شب است ایں ز مہر و پیوند است

خیال جان کی آفت (یعنی روح کے لیے مصیبت) اور خواب دشمن چشم (یعنی جسم کے لیے بلا) ہے، ان سے محبت و قربت کا کوئی تعلق نہیں، ان کی حیثیت بلائے نیم شب کی ہے

نہ زلف دانم و نہ دام ایں قدر دانم
کہ پائے تا بسرم ہر چہ ہست در بند است

نہ میں زلف کو جانتا ہوں اور نہ دام کو صرف اس قدر جانتا ہوں کہ میرے سر سے پیر تک جو کچھ ہے وہ قید میں ہے۔

ازاں خوشم بہ سخنہائے دلکش تو رجم
کہ زندگی بادا ہائے دوست مانند است

رجم میں تمہارے دل کش کلام سے خوش ہوں کہ زندگی دوست کی اداؤں کی مانند ہے۔

تمام مہر و محبت شدم نمی دانم
کہ دل کدام و محبت کدام و یار کدام

میں سراپا مہر و محبت ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ دل کہاں ہے، محبت کہاں ہے اور یار کہاں ہے۔

در آفرینش تو قدسیاں دریں غلطند
کہ آفریدہ کدام، آفریدگار کدام

ملائکہ تیری تخلیق میں غلطاں ہیں یعنی یہ جاننے کے لیے کہ مخلوق کون ہے اور خالق کون ہے؟

چوں عشق پردہ براندازد می تواں دانست
کہ تازہ روے کدام است وشرمسار کدام

جب عشق پردہ اٹھا دے گا تو اس وقت معلوم ہوگا کہ کون تازہ رو ہے یعنی کس کی جبیں عرق ہائے ندامت سے خالی ہے اور کون احساس خطا سے شرمسار ہے۔

متاع جور و جفا کر جہاں جہاں داری
بیا بیا کہ دلم می کند خریداری

جور و جفا کا سامان دنیا میں جہاں جہاں ہو اس کو لے آؤ کہ میرا دل اس کا خریدار ہے۔

گر بدل جوئے فتد سرو کار
ہمہ اعضائے من دل آرد بار

اگر دل میں تیری محبت کی نہر آکر گرے تو میرے تمام اعضا سے دل بصورت نظر آئے۔

ہرچند نیست بزم وصال تو بارقیب
شرم تو باہزار نگہباں برابر است

اگرچہ تیری بزم وصال رقیب کے ساتھ نہیں ہے لیکن اس کی وجہ محض یہ ہے کہ تیری حیا ہزار نگہبانوں کے برابر ہے۔

نسیم وصل گویا می وزد کز کوئے یار امشب
کہ دل بانا امیدیہا نمی گیرد قرار امشب

آج کی رات نا امیدی کے سبب سے دل بے قرار ہے کیوں کہ کوچۂ یار سے جو ہوا چل کر آرہی ہے وہ نسیم وصال کی کیفیت لیے ہوئے ہے۔

رحمے کن ۔ ویک تیر بسوی جگر انداز
کاں تیر نخستیں کہ زدی بر جگر آمد

رحم کرو۔ ہاں ایک تیر اور جگر کی طرف پھینکو اس لیے کہ پہلا تیر جو تم نے مارا تھا وہ جگر سے باہر آگیا ہے۔

تو کہ از عہدۂ یک دل شدہ بیروں نائی
ہمہ ہمہ خلق گرفتار چرا باید کرد

تو کہ کبھی ایک دل کے سوا کسی دوسرے دل میں نہیں رہا پھر یہ تمام مخلوق کی گرفتاری کس لیے ہے؟۔

رباعیاں

اے ساقی بہ ہمہ محبت جامے　　اے قاصد ز غمزہ نہاں پیغامے
تا کے ہدف تیر تغافل باشم　　لطفے، قہرے تبسمے، دشنامے

اے ساقی محبت سے ایک جام کر۔ اے قاصد اشارہ سے مخفی پیغام سنادے۔ کب تک میں تیر تغافل کا شکار رہوں، کبھی لطف۔ کبھی قہر، کبھی تبسم تو کبھی دشنام۔

جاسوس دلم بہ سوے لو بوے تو بس　　اسباب پریشانی من موئے تو بس
دربان محرماں ہمیں خوئے تو بس　　مشاطہ روئے تو ہمیں روئے تو بس

میرا دل تو تیرے ہی موتی کی جستجو میں ہے کسی اور کی جستجو نہیں، میری پریشانی کے اسباب تیرے بال ہیں، اس کے سوا کوئی اور نہیں، تیری تو ہی محرموں کی دربانی کے لیے کافی ہے۔ اور کسی دربان کی حاجت نہیں، تیرے چہرے کی زینت ہی تیرے لیے مشاطہ ہے۔ کسی اور مشاطہ کی ضرورت نہیں۔

دل دادم و باد آشنائی کردم　　در رہ روشش رہ نمائی کردم
چوں نیک بیازمودش در رہ عشق　　کم حوصلہ بود از و جدائی کردم

میں نے دل دے کر آہ و نالے سے تعلق جوڑ لیا اور اس کی روش کی راہ میں اوروں کی بھی رہنمائی کی لیکن رہ عشق میں اس کو تھوڑا سا آزمایا تو کم حوصلہ پایا اس لیے اس سے جدائی اختیار کر لی۔

آشفتگی دل از بہارِ غم تست　　خون دل و دیدہ لالہ زار غم تست
ایں کوہ بلا راکہ تواند برداشت　　چو نشہ مستی کہ بر دباد غم تست

تیرے غم کی بہار سے دل کی آشفتگی ہے، تیرے غم کی لالہ زاری دیدہ و دل کا خون ہے۔ یہ نشہ مستی تھا کہ تیرے غم کے بوجھ کو اٹھا لیا ورنہ اس بلا کو کون اٹھا سکتا تھا۔

سرمایہ عمر و زندگانی غم تست　　بہتر از ہزار شادمانی غم تست
گفتی کہ چنیں والہ و شدات کہ کرد　　دانی غم تو وگر ندانی غم تست

تیرا غم ہی میری عمر اور زندگانی کا سرمایہ ہے، تیرا غم ہزاروں شادمانیوں سے بہتر ہے۔ تو نے کہا کہ کون ہے جس نے تمہیں اس درجہ دیوانہ بنا رکھا ہے خواہ تو جانے یا نہ جانے۔ یہ تیرا غم ہے جس نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔

اے دل تو دریں واقعہ دمسازی کن　　وی جاں بموافقت سراندازی کن
اے صبر تو تاب غم نداری بگریز　　وی عقل تو کودکی بردباری کن

اے دل تو اس واقعہ میں رفاقت کر، اے جان تو موافقت میں سر ڈال دے، اے صبر تو غم کی طاقت نہیں رکھتا تو اپنی راہ لے، اے عقل تو ابھی طفل ہے صبر و تحمل سے کام لے

در آتش عشق جاں گدازی دگر است　　از بہر وصال چارہ سازی دگر است
جاناتو غم ندیدۂ معذوری　　بازی دگر است و عشق بازی دگر است

عشق کی آگ میں جان گدازی اور چیز ہے۔ اور وصال کے لیے چارہ سازی اور چیز ہے۔ میرے یار تم نے غم دیکھا ہی نہیں اس لیے معذور ہو کھیل تماشہ اور چیز ہے۔ اور عشق بازی اور چیز ہے۔

زخود مگوی ہنرہائے خویشتن ہر چند　　از انچہ بازنمائی ہزار چند انست

طعام اگر زلذت نیو فتد بہ طعام   مگس چو او فتد مکروہ پاک طبعانست

خود اپنے ہنروں کو کبھی بیان نہ کرو اس لیے کہ جتنا بھی کہوگے وہ تھوڑا ہوگا۔ جس طرح کھانے میں مکھی کے گرنے سے کھانے کی لذت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا لیکن پاک طبع لوگوں کی نظر میں وہ مکروہ ہو جاتا ہے۔

II تصوف

عبدالرحیم خانخاناں کو تصوف اور صوفیا سے بھی دل چسپی تھی۔ اس کے سوانح نگار نے اسے سلطان کے لباس میں درویش بتایا ہے۔ اس کا ہندی کلام صوفیانہ فکر کا حامل ہے اور زندگی کے تئیں اس کا رویہ اور رجحان بھی اس کے درویشی مزاج کی نشاندہی کرتا ہے اس کی سیرت و شخصیت کے تحت ہم نے لکھا ہے کہ وہ شیعہ نہیں تھا بلکہ شیعی میلانات رکھتا تھا۔ اس کی رگوں میں شیعہ باپ کا خون دوڑ رہا تھا اس کے علاوہ قراقلو ترک بھی شیعی عقائد رکھتے تھے۔ شیعی مسلک صوفی مسلکوں کے قریب ہے۔ تمام صوفی اپنی روایات کا سلسلہ حضرت علیؓ سے جوڑتے ہیں خانخاناں کی آزادئ فکر۔ رواداری اور وسیع المشربی اسے صوفیوں اور شیعوں کے قریب کر دیتی ہے۔ تصوف اور صوفیا سے اس کے تعلق خاطر کی چند مثالیں یہاں پیش کرتے ہیں۔

خانخاناں نے مکتوبات سعدی کا مخطوطہ بڑی کوششوں سے حاصل کیا تھا۔ کیوں کہ ان میں صوفیانہ تعلیمات بیان کی گئی ہیں۔ فردوسیہ سلسلہ کے مشہور صوفی حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کے لکھے خطوط جو تعداد میں ایک سو تھے خاص طور پر مہیا کیے۔ اور ان میں خصوصی دل چسپی ظاہر کی۔ ان خطوط میں تصوف کو اسلامی شریعت کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ آج بھی مسلمانوں میں یہ خطوط مقبول ہیں۔

اس سلسلہ میں عبدالقادر بدایونی کا بیان نہ صرف یہ کہ دلچسپ ہے بلکہ قابل اعتبار بھی۔ اس کی تاریخ ایک مستند ہم عصر ماخذ ہے۔ وہ بے باک قلم کار تھا۔ بادشاہ کو بھی کھری کھری سنانے سے چوکتا نہیں تھا۔ اس کی تاریخ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں چھپ نہیں سکی کیوں کہ اس پر پابندی عائد تھی۔ ملا چُھپ چُھپ کر لکھتا تھا۔ جہانگیر نے ایکبار

اس کے گھر کی تلاشی بھی لی تھی مگر مسودہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ بدایونی نے ریاکار صوفیا اور علما کی سخت گرفت کی ہے۔ مگر اس نے خانخاناں کی تعریف کی ہے کہ صوفیا اور بزرگوں کی سرپرستی کرتا تھا۔ ایک جگہ پر خانخاناں کو تنبیہ بھی کرتا ہے کہ بیابانی نام کے ایک مکّار صوفی کے چکر میں پھنس گیا جو شعبدہ بازی کو معجزات کا نام دیکر لوگوں کو الو بناتا تھا۔

سندھ کے قیام کے دوران خانخاناں بھکّر کے مقام پر اپنے زمانہ کے مشہور صوفی قاضی عثمان کی خانقاہ میں حاضر ہوا۔ گھنٹوں ان کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھا رہا۔ انہوں نے خانخاناں کو جانی بیگ کے خلاف فتح کا مژدہ سنایا۔ سندھ کے لوگوں نے خواب میں دیکھا کہ خانخاں کو قاضی عثمان کی وجہ سے فتح نصیب ہوئی۔ سندھ میں اور بھی بہت سے صوفیوں سے ان کا تعلق رہا۔

برہان پور کو خاندیش کے فاروقی حکمرانوں نے ۱۳۸۰ء میں آباد کیا تھا۔ چشتی سلسلہ کے صوفی برہان الدین غریبؒ متوفی ۱۳۴۴ کے نام پر شہر کا نام برہان پور رکھا گیا۔ حضرت برہان الدین کا مزار خلد آباد میں ہے۔

انھیں موسیقی سے دل چسپی تھی وہ خود بھی رقص کرتے تھے۔ برہان پور دکن کا شمالی کنارہ ہے۔ دہلی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد یہاں بہت سے صوفیا آکر بس گئے تھے۔ ان میں ٹھٹھہ کے رہنے والی صوفی بھی تھے جن مین بیشتر جولا ہے تھے۔ سندھی صوفی قادریہ سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ برہان پور میں یہ لوگ آباد ہوئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سندھ اور دکن سے خانخاناں کا کتنا گہرا تعلق رہا۔ ان علاقوں میں صوفیا کے ساتھ تعلق کی کوئی ہم عصر سند ہمارے پاس نہیں ہے تاہم ہم اندازہ ہی لگا سکتے ہیں۔

بھکّر (سندھ) میں خانخاناں کی ملاقات میر معصوم بھکری سے ہوئی۔ وہ پایہ کا بزرگ، عالم، خطاط اور مورخ تھا۔ اس نے گجرات کی مہم میں خانخاناں کی مدد کی تھی اسنے اکبر و جہانگیر کے عہد میں فتح پور سیکری کی عمارتوں کے کتبے لکھے تھے۔ خانخاناں اس پر بہت مہربان تھا۔ میر معصوم واپس بھکر آنا چاہتا تھا۔ خانخاناں نے بادشاہ سے اس کی سفارش کی اور وہ بھکر آگیا اور خانخاناں سے ملا۔

بھکّر کے مقام پر خانخاناں کی ملاقات حضرت حاجی سلطان تھانیسری سے ہوئی وہ بلند پایہ عالم اور درویش تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی رح کے خسر تھے۔ اکبر نے انھیں ایک علاقہ کا کروڑی بنایا تھا مگر انھوں نے محصول دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اکبر ملحد ہے انھوں نے دس سال تک کوئی محصول نہیں دیا اور تمام محصول فقرا میں تقسیم کر دیتے تھے۔ انھوں نے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا ملا بدایونی جس شعبہ کے انچارج تھے۔ ملا نے تھانیسری کے بارے میں لکھا ہے کہ ترجمہ اتنا اصل کے مطابق ہوتا تھا کہ مسوّدہ پر مکھی کا میل تک ترجمہ میں آجاتا تھا۔ حضرت شیخ نے ایک گائے ذبح کر دی تھی۔ اکبر کے زمانہ میں گائے کے ذبح کرنے پر پابندی عائد تھی۔ جب وہ کروڑی تھے تو ان کے خلاف ہندوؤں کی اور بہت سی شکایتیں تھیں۔ جن کی وجہ سے بادشاہ ان سے ناراض ہوگیا اور انہیں پھانسی دے دی۔ اکبر کے خلاف شیخ احمد سرہندی رح کی شدید نفرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

عبدالرحیم خانخاناں کا شیخ سلطان تھانیسری سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ بھکر میں جب خانخانان کی ان سے ملاقات ہوئی تو وہ جلد وطنی کی زندگی گذار رہے تھے۔ خانخاناں کی سفارش پر حاجی صاحب کو ان کی کھوئی ہوئی جاگیر واپس مل گئی تھی۔ مگر یہ سفارش بھی کام نہ آئی اور ان کا عبرتناک انجام ہوا۔ بعد میں خانخاناں حاجی صاحب کے بیٹوں پر بھی عنایت کرتے رہے جیساکہ امام ربّانی کے خطوط سے ظاہر ہے۔ انہی خطوط سے خانخاناں کی درویش نوازی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ خطوط کی روشنی میں ہم نے خانخانان اور شیخ احمد سرہندی کے تعلقات پر الگ باب میں روشنی ڈالی ہے۔

(۱۱)

تعمیرات

خانخاناں جب تک زندہ رہا اپنے عہد پر چھائے رہا۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس پر اس کی شخصیت کی چھاپ نہ ہو۔ فنون لطیفہ علم وادب، سیاست وحکومت، مذہب وسماج غرض ہر میدان میں خانخاناں کے فکر و نظر کی جلوہ سامانیاں نظر آتی ہیں۔ وہ جہاں جہاں رہا اس نے اپنی شخصیت کے نقوش چھوڑے۔ عوام کے آرام کے لیے فلاحی اور انتظامی کام کئے۔ باغ لگوائے۔ عمارتیں تعمیر کرائیں سرائے بنوائیں۔ نئی بستیاں بسائیں۔ پانی کے لیے تالاب اور کنویں کھدوائے۔

خانخاناں نے گجرات کی فتح کی خوشی میں ۱۵۸۴ء میں سرکھیج کے مقام پر ایک باغ بنوایا جس کا نام فتح باغ یا باغ فتح تھا۔ یہ وہی باغ تھا جس میں خانخاناں نے جہانگیر کی دعوت کی تھی اور اس کی بیٹی نے باغ کو مصنوعی پھولوں سے سجایا تھا۔ سابرمتی کے کنارے پر بنا یہ باغ اس عہد میں ایک عظیم الشان تفریح گاہ بن گیا تھا۔ جو بھی سیاح گجرات آتا اس باغ کی ضرور سیر کرتا اور وہاں سے باغ کی تعریف کرتا ہوا لوٹتا۔ احمد آباد کے قریب ہونے کی وجہ سے یہ وہاں کے لوگوں کیلیے پکنک اسپاٹ تھا۔ باغ پچاس ایکڑ زمین میں پھیلا ہوا تھا اور جس کے چاروں طرف چہار دیواری تھی اور آرام کے لئے بہت سی عمارتیں بنوائی گئی تھیں۔ دنیا کے کونے کونے سے طرح طرح کے پھولوں کے پودے اور پیڑ لاکر یہاں لگائے گئے تھے۔ جہانگیر دوسری بار جب گجرات گیا تب بھی اس باغ کو دیکھنے گیا اور تزک میں خاص طور پر باغ کی تعریف لکھی۔ سیر کے دوران اس نے بہت سے پھلوں کو اپنے ہاتھوں سے توڑا۔ اس نے ایک انجیر توڑا جس کا وزن ساڑھے

سات تولہ تھا اور اتنا بڑا انجیر اور کہیں پیدا نہیں ہوتا تھا۔

یورپی سیاحوں نے فیض باغ کی سیر کی اور اپنے سفرناموں میں اس کی خوبصورتی کو بیان کیا۔ کئی صدیوں تک یہ باغ لوگوں کے لیے دلکشی کا باعث بنا رہا۔ لیکن افسوس اٹھارویں صدی میں مراٹھوں کی شورشوں کی وجہ سے یہ باغ تباہ و برباد ہوگیا اور ڈاکوؤں کی پناہ گاہ بن گیا بہت سے جاگیرداروں نے اس کی زمین پر قبضہ کرلیا اور وہاں کھیتی باڑی ہونے لگی۔

خانخاناں نے اپنی صدبیداری کے زمانہ میں برہان پور میں بہت سی اصلاحیں نافذ کیں۔ برہان پور میں پانی کی قلت رہتی تھی اور لوگوں کی یہ عام شکایت تھی۔ خانخاناں نے آب رسانی کا جدید نظام قائم کیا۔ شہر کے وسط میں ایک وسیع حوض بنوایا جس میں آس پاس کی پہاڑیوں سے پانی حوض تک پہنچایا گیا۔ یہاں سے پانی چھوٹی چھوٹی نالیوں اور پائپوں کے ذریعہ گھروں تک سپلائی کیا جاتا تھا۔

برہان پور میں خانخاناں نے ایک باغ بھی لگوایا جس کا نام لال باغ تھا۔ اس باغ کے بیچ میں بھی ایک تالاب بنوایا جو چالیس مربع گز پر پھیلا ہوا تھا۔ ہواخوری کے لیے تالاب کے درمیان ایک عمارت بنوائی جس میں دالان و برآمدے تھے۔ عمارت تک پہنچنے کے لئے تالاب کے اندر سے چار راہداریاں تھیں جن کے گرد طرح طرح کے درخت اور پھول پودے لگائے گئے تھے۔ ایک ایسے نیلوفر پھول کی بیل بھی یہاں لگائی گئی جو اپنی خوشبو اور خوبصورتی میں لاثانی تھا۔

برہان پور میں خراسانی تربوز اگانے کا تجربہ بھی کیا۔ ایک آدمی کو خاص طور پر خراسان بھیجا گیا جہاں سے وہ تربوز کے بیج لے کر آیا۔ برہان پور کے قریب ایک گاؤں کو اس کی کاشت کے لئے چنا گیا جہاں یہ تجربہ کامیاب رہا۔ یہاں کے تربوز بادشاہ کی خدمت میں بھیجے جاتے تھے۔

برہان پور کی جامع مسجد کی تعمیر نو کرائی۔ خاندیش کے صوبیدار راجہ علی خاں نے یہ مسجد تعمیر کرائی تھی جو ایک سادہ سی عمارت تھی۔ خانخاناں نے اس میں مزید اضافہ کیا۔ برہان پور میں اپنی رہائش کے لئے ایک محل بھی تعمیر کرایا۔

خانخاناں نے اپنی حیات ہی میں اپنی بیوی کی قبر پر مقبرہ تعمیر کرایا تھا جس

میں وہ خود بھی مدفون ہے۔ خانخانان کا مقبرہ مغل فن تعمیر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ساٹھ سال پہلے ہمایوں کا مقبرہ تعمیر ہوا تھا جس میں ایرانی و بازنطینی فن تعمیر غالب تھا۔ فن تعمیر کے ان دونوں نمونوں کے بیچ بہت سی مغل عمارتیں وجود میں آئیں جن میں سکندرہ میں واقع اکبر کا مقبرہ اور لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ برخلاف مقبرہ ہمایوں کے ان دونوں عمارتوں میں مقامی یا ہندوستانی فن تعمیر کی خصوصیات نمایاں ہیں چونکہ ان کے زیادہ تر کاریگر ہندوستانی تھے اور وہ سب آقاؤں کے تصورات کو پوری طرح پتھر اور چونے میں ڈھالنے میں قاصر تھے اس لیے انہوں نے بہت کچھ اپنے خیال سے شامل کر دیا۔ جس کی وجہ سے انڈو ایرانی فن تعمیر وجود میں آیا۔ خانخاناں کے مقبرہ میں پھر سے خالص ایرانی فن تعمیر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ ہمایوں کے مقبرہ کی نقل نظر آتا ہے مگر بہت کچھ مختلف بھی ہے۔ یہ زیادہ سادہ ہے۔ ہمایوں کا مقبرہ ہشت پہلو ہے جب کہ یہ چوکور ہے۔ ایک بلند چبوترہ جس کے چاروں طرف سترہ سترہ دروازوں کی شکلیں۔ دوہرا گنبد۔ بلند دروازے او محرابیں ہمایوں کے مقبرہ کی طرح ہیں۔۔یہی فن تعمیر بعد میں اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ تاج محل میں دہرایا گیا ہے۔ افسوس کہ اٹھارویں صدی میں آصف الدولہ کے زمانہ میں خانخاناں کے مقبرہ کا سنگ مرمر اور سنگ سرخ چرا لیا گیا اور کچھ صفدر جنگ کے مقبرہ میں استعمال کر لیا گیا۔

اپنے چہیتے اور وفادار غلام میاں فہیم کا مقبرہ بھی خانخاناں نے تعمیر کرایا تھا اس کے بارے میں آثار الصنادید میں لکھا ہے۔

"ہمایوں کے مقبرہ کے پاس ہے۔ کوئی تو اس کو حجام کا مقبرہ بتاتا ہے اور کوئی فہیم کا۔ پہلی بات تو یقیناً غلط ہے۔ دوسری بات اگر صحیح ہو تو یہ مقبرہ عبدالرحیم خانخاناں کا بنوایا ہوا ہے۔ ۱۰۳۳ھ مطابق ۱۶۲۳ء میں جب کہ مہابت خاں نے خانخاناں کو براہ دغا نظر بند کیا تو پہلے فہیم پاس جو خانخاناں کے بڑے عزیز چیلوں میں سے تھا پیغام سفارش بھیجا۔ اس نے زمانا۔ اور زمانا اور اپنے بیٹے اور چالیس رفیقوں کے

ساتھ لڑ کر مارا گیا۔ غالب ہے کہ جب خانخاناں بیس جلوس جہانگیری مطابق

۱۰۳۴ھ موافق ۱۶۲۴ء کے چھوٹا تو تب اس نے یہ مقبرہ بنوایا۔ یہ مقبرہ بالکل چینی کاری ہے اور خوش رنگ اور خوبصورت چینی کاری اور رنگ آمیزی کی ہوئی ہے کہ دیکھنے سے علاقہ رکھتی ہے۔ برج اس مقبرہ کا بالکل نیلے رنگ کا ہے اور اسی وجہ سے نیلہ برج کے نام سے مشہور ہے۔"

لاہور میں خانخاناں نے ایک سرائے بھی تعمیر کرائی تھی۔ اس سرائے کا حال غیر ملکی سیاحوں کے سفرناموں میں بھی ملتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سرائے میں پہنچکر مسافر اپنی تمام کلفت بھول جاتا ہے۔ خانخاناں نے ایران کے طرز پر حماموں کو بھی رواج دیا۔ حمام ہندوستان کے لیئے بالکل نیا تصور تھا۔ خانخاناں نے حماموں کو شہری منصوبہ بندی کے ایک پہلو کے طور پر اپنایا اور ایسے حمام بھی بنوائے جو صرف عوام کے لئے تھے۔

سمندر پر پرتگالیوں کا قبضہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو سمندری سفر میں دشواریاں پیش آتی تھیں۔ خانخاناں نے اپنے ذاتی خرچ سے تین جہاز بنوائے جن کے نام رحیمی۔ کریمی اور سالاری رکھے گیے مسلمان عام طور پر ان جہازوں میں حج کے لیے جاتے تھے۔

(۱۲)

خانخاناں اور شیخ احمد سرہندیؒ

شیخ احمد سرہندیؒ المعروف مجدد الف ثانی اپنے زمانہ کے جید عالم اور صوفی تھے۔ ان کے مذہبی افکار سے کئی نسلیں متاثر ہوئیں بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ہندوستان میں اسلامی احیا پرستی اور بنیاد پرستی کے اولین معمار وہی ہیں۔ آج کی جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت جیسی تنظیموں نے خام مواد شیخ احمد سرہندی سے حاصل کیا ہے۔ ان کے خطوط جو انھوں نے اپنے مریدوں امرار اور شہزادوں کو لکھے اکبری عہد کے افکار کے خلاف زبردست ردعمل تھا جس نے ایک مہم اور تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی اور مشترکہ تہذیب کے عمل پر جو اس عہد میں اپنے عروج پر تھا روک لگا دی۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام پر ہندو اور شیعی عناصر نے جو بدعت ہیں غلبہ کرلیا۔ اسلام کو ان عناصر سے پاک کرنا چاہئے۔ وہ اسلام میں تمام فرقوں کو باطل قرار دیتے تھے اور صرف حنفی مسلک کے پیروکار سنت والجماعت کو حق پر سمجھتے تھے ان کے نزدیک صرف یہی واحد فرقہ ناجی یعنی جنتی تھا۔ انھوں نے نظریہ وحدت الوجود کو رد کیا اور اس کی جگہ وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا۔ وہ حضرت باقی باللہؒ سے بیعت تھے اور ان کے نظریات کے زبردست مبلغ بن گئے تھے۔ انھوں نے ردروافض کے نام سے شیعوں کے خلاف کتاب لکھی۔

کہا جاتا ہے کہ فوج میں ان کا کافی اثر تھا۔ اس زمانہ کی ایک ممتاز شخصیت شیخ فرید بخاری مرتضیٰ خاں سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ شیخ فرید بادشاہ گر مشہور تھے۔ غیر جانب دار امرا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ جہانگیر کی تخت نشینی انہی کی رہین منت تھی۔ وہ میر بخشی کے بلند عہدہ پر فائز تھے۔ شیخ فرید کے نام انھوں نے خطوط لکھے۔

ان کا کہنا تھا کہ پہلے امرار اور فوجی افسروں کو اپنا ہمنوا بنایا جائے۔ ان کے ماتحت لوگ خود بخود ان کی روش اختیار کرلیں گے۔

اسی مقصد سے انھوں نے خانخاناں کو بھی خطوط لکھے۔ ان خطوں سے نہ صرف یہ کہ دونوں کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے بلکہ شیخ کا نظریہ اور طریقہ کار سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ خانخاناں نے بھی شیخ کو خطوط لکھے مگر افسوس کہ یہ خطوط دستیاب نہیں۔ حضرت شیخ احمد نے خانخاناں کو ایک درجن کے قریب خطوط لکھے ان خطوں میں خانخاناں کی تعریف ملتی ہے۔ اسے تنبیہہ و تاکید بھی کرتے ہیں۔ ضرورت مندوں کے لیے سفارش بھی کرتے ہیں۔ بیشتر خطوط میں اپنے نظریات کی تبلیغ ہی نظر آتی ہے۔ ایک خط کے سرنامہ پر ایک شعر لکھتے ہیں جس کا مطلب ہے۔

"تبلیغ کی شرط کے تحت میں نے جو کچھ ہے کہدیا ہے۔ باقی آپ جانیں اس سے نصیحت حاصل کریں یا رنج و ملال"

اسی خط میں لکھتے ہیں۔

"یہ ٹھیک ہے آپ نے فقرا کی خدمت بہت کی ہے لیکن ساتھ ہی فقرا کا لحاظ بھی ضروری ہے تاکہ اس سے ثمرہ اور نتیجہ برآمد ہو اور اس کے بغیر تو خار دار درخت پر ہاتھ پھیرنے والی بات ہے یعنی کوئی فائدہ نہیں" حضرت شیخ ایک دوسرے خط میں رقمطراز ہیں "چونکہ آپ نے فقرا کے آداب کا لحاظ رکھا ہے اور باتوں میں تواضع اختیار کی ہے۔ اس کے مطابق من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ (حدیث) یعنی جو اللّٰہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللّٰہ اسے بلندی عطا کرتا ہے امید ہے کہ آپ کا یہ عجز و تواضع آپ کی دینی و دنیوی رفعت کا سبب بنے بلکہ بن چکا ہے۔ آپ کو بشارت ہو۔ چونکہ آپ درمیان میں رجوع اور انابت کے الفاظ لے آئے ہیں اس لیے یوں تصور کریں کہ آپ کا یہ رجوع درویشوں میں سے کسی درویش کے ہاتھ پر واقع ہو چکا ہے۔ لہٰذا اچھے ثمرات و نتائج کے منتظر رہیں۔ لیکن حتی الامکان درویشوں کے حقوق و آداب کا لحاظ رکھیں"

اسی خط میں نہایت شدت اور جوش کے ساتھ اپنے نظریہ کی تبلیغ کرتے ہیں۔

"مختصر یہ کہ نجات کا راستہ اہل سنّت و جماعت کی متابعت ہے (اللّٰہ تعالیٰ اس گروہ

کو اور زیادہ کرے ہم اقوال میں بھی۔ افعال میں بھی۔ اور احوال و فروع میں بھی کیونکہ نجات والا فرقہ صرف یہی ہے۔ باقی تمام فرقے زوال اور ہلاکت کے کنارے کھڑے ہیں۔ آج کسی کے علم میں یہ بات آئے یا نہ آئے لیکن کل (قیامت) کو ہر ایک جان لے گا مگر اس وقت جاننا بے سود ہوگا۔" [1]

عبدالرحیم خانخاناں کے ایک دستی خط کے جواب میں حضرت مجدد الف ثانی ایک خط میں تحریر کرتے ہیں۔ خط ختم کرنے کے بعد پس نوشت کے طور پر لکھتے ہیں کہ جو برادر سعادت یہ خط لے کر آیا تھا اس نے بتایا کہ اس کے ساتھیوں میں ایک شاعر ہے جو کفری تخلص کرتا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، "حالانکہ یہ شاعر سادات عظام اور نقبائے کرام میں سے ہیں۔ کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ اسے بین الشناتم بُرے اسم پر کس چیز نے برانگیختہ کیا۔ مسلمانوں کے لئے مناسب ہے کہ اس برے نام سے شیر سے بھی زیادہ بھاگے اور اس سے پوری طرح نفرت و کراہت کرے کیونکہ یہ اسم اور اس کا مسمیٰ دونوں اللہ اور اس کے رسول کے ہاں ناپسندیدہ و مبغوض ہیں۔ مسلمانوں کو تو حکم ہے کہ اہل کفر سے عداوت رکھیں اور ان پر سختی رکھیں [2] لہٰذا ایسے برے اسم سے احتراز و پرہیز ضروری اور واجب ہے۔ اور بعض مشائخ قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کی عبادات میں غلبہ سکر میں جو کفر کی مدح اور زنار وغیرہ باندھنے کی ترغیب واقع ہوئی ہے۔ اس کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں اور ان کی تاویل کی گئی ہے۔ کیونکہ مستوں (۲۹) کا کلام ٹھیک معنی پر محمول کیا جاتا ہے اور ظاہری اور قریب الفہم معنی پر محمول نہیں کیا جاتا۔" [3]

خانخاناں کے نام ایک اور خط سے حضرت شیخ کے نظریہ اور طرز فکر پر روشنی پڑتی

---

[1] حضرت شیخ نے یہ کیسے جان لیا کہ نجات والا فرقہ صرف یہی ہے۔ یہ بات تو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ اب ان کے بیان کی تصدیق کے لیے قیامت تک انتظار کرنا ضروری ہے۔

[2] برصغیر میں نفرت کی اس تبلیغ کا خمیازہ مسلمان آج تک بھگت رہے ہیں۔

[3] اس عہد میں صوفیا کا بڑا طبقہ ہندو مذہب کی ان علامتوں کا استعمال اپنے کلام میں کرتا تھا جن کی مثالیں ہم پیش کر چکے ہیں۔ رحیم نے بھی اپنی شاعری میں اس طرح کی علامتیں استعمال کی ہیں۔

ہے وہ لکھتے ہیں ۔

"اگر پوچھیں صفات (نیکیوں) میں اجر کئی گنا ہے اور برائیوں میں ان کے مثل (برابر) جزا ہے تو پھر کفار کو چند روزہ برائیوں کے عوض ہمیشہ کا عذاب کیوں ہو گا؟ میں کہتا ہوں عمل کیلیے جزا کا ہم مثل ہونا واجب اللہ تعالیٰ کے علم پر موقوف ہے جس کے سمجھنے سے ممکن کا علم قاصر ہے۔

مثلاً قذف محصنات یعنی نیک بیاہی عورتوں کو زنا کی تہمت لگانے میں اس کے ہم مثل جزا اسی کوڑے فرمائی ہے اور چور کی حد میں چور کا دایاں ہاتھ کاٹ ڈالنا اس کی جزا ہے۔ اور زنا کی حد میں کنوارے کا کنواری کے ساتھ زنا کی صورت میں سو کوڑے یا ایک سال جلاوطن مقرر کی ہے۔ اور شادی شدہ آدمی کا شادی شدہ عورت کے ساتھ زنا کی صورت میں رجم یعنی سنگساری کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ ان حدود اور تقدیرات کا علم انسان کی طاقت سے خارج ہے۔

ذٰلِکَ تقدیرُ العزیزِ العلیم یعنی یہ خدائے عزیز وعلیم کا اندازہ ہے۔ پس کفار کے بارے میں حق تعالیٰ نے کفر موقت کے موافق ہمیشہ کا عذاب جزا فرمائی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ کفر موقت کی ہم مثل جزا یہی ہمیشہ کا عذاب ہے اور وہ شخص جو تمام احکام شرعیہ کو اپنی عقل کے مطابق کرنا چاہے اور عقل و دلائل کے برابر کرنا چاہے وہ شانِ نبوت کا منکر ہے۔ اسکے ساتھ کلام کرنا بیوقوفی ہے۔" یہاں حضرت شیخ نے غور و فکر کے تمام دروازے بند کر دیے ایک بہت اہم سوال تھا کہ ایک نیکی کے عوض دس گنا ثواب ہے جب کہ ایک برائی کے عوض اسی قدر عذاب ملے گا۔ کافر کے گناہوں کی سزا بھی اسی حساب سے ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کو سب سے بڑا منصف بتایا گیا ہے اور اسلام کی سب سے بڑی اساس عدل ہے۔ پھر یہ دھاندلی کیوں؟ حضرت شیخ سے جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو بات کو تاویلوں کی بھول بھلیوں میں الجھا کر ختم کر دیا۔

شیخ احمد سرہندی کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ ادیب تھے۔ ان کی نثر میں مولانا آزاد کی سی خطابت ہے۔ وہ اپنی تحریر کو مولانا کی طرح عربی اور فارسی شعروں سے مزین کرتے ہیں۔ احادیث اور قرآن سے بے ساختہ

حوالے نقل کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان نہایت موثر ہے۔ سفارش کرتے ہیں یا مراعات طلب کرتے ہیں تو نہایت حسین پیرایہ میں۔ ایک عزیز کی سفارش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"سیادت پناہ! حقائق و معارف آگاہ! میرے بھائی اور میرے عزیز میر محمد نعمان کا وجود شریف آپ کے علاقہ میں بہت غنیمت ہے اور ان کی دعا اور توجہ کبریت احمد ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی دولت کی پختگی اور پائیداری انہی کی توجہات کے فیوض و برکات سے ہے۔ اور میں غائب اور حاضر میں ان کو آپ کا ممد و معاون پاتا ہوں۔ ایک سال سے زیادہ ہو گیا کہ انھوں نے آپ کی خوبیاں غائبانہ طور پر اس فقیر کو لکھ بھیجی تھیں اور جو آپ کو اس فقیر کی نسبت محبت و اخلاص ہے وہ بھی درج کیا تھا اور یہ اظہار کیا تھا کہ اس علاقہ کی صوبیداری کسی اور کے سپرد کر رہے ہیں۔ یہ وقت توجہ اور دستگیری کا ہے۔ فقیر کو اس خط کے مطالعہ کے دوران میں اس متعلق توجہ حاصل ہوئی تو اس وقت آپ کا بہت بلند مرتبہ دیکھا (اسی لیے میں نے ایک خط میں) یہ عبارت لکھی کہ مجھے خانخاناں بہت بلند مرتبہ نظر آتے ہیں اور معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے"۔

اور اسی خط میں جو تمہید باندھتے ہیں وہ یہ ہے کہ :۔

"اکثر دولت مند لوگ اس وقت درویش کے لیے محتاجی کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ انسان اپنی ذات میں محتاج ہے۔ بلکہ تمام کائنات فطرتاً محتاج ہے۔ بلکہ انسان کی خوبی ہی اس محتاجی میں ہے اور اس کی بندگی اور مسکینی اسی راہ سے پیدا ہوتی ہے۔ فرض کرو اگر محتاجی انسان سے زائل ہو جائے اور استغنا آ جائے تو سوائے گناہ اور سرکشی اور طغیانی اور نافرمانی کے اور کیا چیز اس کو حاصل ہو گی"۔

ایک اور خط میں سفارش کا دلکش انداز ملاحظہ فرمائیے۔

"دو ضروری اور اہم کام بے اختیار آپ کو تکلیف دینے کا باعث بنے ہیں۔ ایک رنج و آزار کا گمان رفع کرنے کا اظہار۔ بلکہ آپ سے دوستی اور اخلاص کا ہونا اور دوسرا ایک محتاج آدمی کی محتاجی کی طرف اشارہ جو فضیلت اور نیکی سے آراستہ

ہے اور معرفت وشہود سے مزین ہے۔ جو نسب کے لحاظ سے کریم اور حسب کے اعتبار سے شریف ہے۔"

سفارش کا ایک نمونہ اور ملاحظہ فرمایئے :۔

"باقی مطلب یہ ہے کہ حامل رقیمہ میاں شیخ احمد مغفرت پناہ شیخ سلطان تھانیسری[1] کا بیٹا ہے۔ آپ کی مہربانیوں اور احسانوں کو یاد کر کے جو آپ نے اس کے والد بزرگوار کی بہ نسبت کیے تھے۔ اس فقیر کو وسیلہ بنا کر آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوتا ہے اور آپ کی مہربانیوں میں سے ایک مہربانی یہ تھی کہ ایک موضع جو پرگنہ اندری میں انعام فرمایا تھا۔ آگے آپ کا اختیار ہے بلکہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔"

حضرت شیخ نے خانخاناں کی تعریف میں کمال کر دکھایا جسے خوشامد کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ خانخاناں کا ایک خط ایک صاحب شیخ کے پاس لے کر حاضر ہوتے ہیں اس خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔

"باسعادت و باصداقت برادر نے تمہارا خط پہنچایا اور زبان ترجمان سے تمہاری جناب کا حال بیان کیا تو میں نے یہ شعر پڑھا ؎

اھلا لسعدی والرسول وحبذا　　　وجہ الرسول لحب وجہ المرسل

(اے سعدی (معشوقہ) اور اے اس کے قاصد! تم اپنے اہل میں تشریف لائے اور تمہاری طرف سے آنے والے قاصد کا چہرا کس قدر حسین ہے کیونکہ روانہ کرنے والے کا چہرہ بڑا محبوب ہے۔[2]

ان خطوط کی روشنی میں اگر ہم خانخاناں کی شخصیت کو دیکھتے ہیں تو وہ بالکل مختلف نظر آتی ہے اس پر مجدد الف ثانی کی تعلیمات کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ اس لیے کہ خانخاناں وجودی نظریہ کے حامل انسان تھے شہودی کے نہیں۔ یہ مراسلت زیب داستان کے لیے تھی۔ خانخاناں اپنے عہد کا ایک صاحب اقتدار شخص تھا۔ بادشاہ کے بعد جن لوگوں کے

---

[1] یہ وہی بزرگ ہیں جن کی خانخاناں نے اپنے سندھ کے قیام کے دوران مدد کی تھی۔

[2] مکتوبات امام ربانی (اردو ترجمہ) مولانا محمد سعید احمد نقشبندی خطیب وامام حضرت داتا گنج بخش ناشر فیصل پبلشنگ ہاؤس۔ محلہ ابوالمعالی دیوبند ۱۹۸۸ء

نام آتے تھے ان میں اس کا نام سرفہرست تھا۔ ہر طبقہ کے لوگوں کی خوشنودی حاصل
کرنا اور ان کے نظریات سے واقفیت رکھنا اس کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔
ورنہ تو حضرت شیخ کے خیالات سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

رحیم کی ہندی شاعری

I پس منظر

عبد الرحیم خانخاناں سے تقریباً چھ سو سال پیشتر ہندی زبان کے ارتقا کا عمل شروع ہوا تھا اور اس کے عہد تک آتے آتے اس زبان نے ادبی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ گو علاقوں کے اعتبار سے یہ مختلف شکلوں میں رائج تھی۔ کہیں یہ برج بھاشا و کھڑی بولی کے نام سے جانی جاتی تھی تو کہیں اس کا نام اودھی و بھوجپوری تھا۔ کہیں راجستھانی و گجراتی تھی تو کہیں بندیلی۔ لیکن اصل میں ایک ہی زبان تھی جو ہندی یا ہندوی تھی۔ اور جو بعد میں اردو کہلائی۔ نئی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت امیر خسرو سے بھی دو سو سال پہلے ہندی زبان رائج تھی اور اس میں شاعری ہو رہی تھی۔ یہی زمانہ ہے جب شورسینی اپ بھرنش ہندی کا روپ اختیار کر رہی ہے ایک ہزار عیسوی میں گورکھ ناتھ نام کا ایک سنت ہوا ہے۔ جو ہندی میں شاعری کرتا تھا۔ اس کے نام پر گورکھ پنتھی ایک فرقہ وجود میں آیا جس کے ماننے والے شعروں کے ذریعہ اپنی تعلیمات کا پرچار کرتے تھے۔ گورکھ پنتھیوں کو بھگتی تحریک کا پیشرو سمجھنا چاہیئے کیوں کہ ان دونوں کا پیغام ایک ہی ہے۔ یہ لوگ پورے ہندوستان میں شمال سے جنوب اور مغرب سے مشرق میں ہر جگہ پھیلے ہوتے تھے۔ گورکھ پنتھیوں کی شاعری کے نمونے بھی دستیاب ہو گئے ہیں۔

گیارہویں اور بارہویں صدی میں بھی ہندی زبان میں شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔ مسعود سعد ابن سلمان (۱۱۳۰ء ۔ ۱۰۴۷ء) کے بارے میں حضرت امیر خسرو نے لکھا ہے کہ وہ ہندی کا صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس کے بعد بہت سے

صوفی شعرا ہوتے ہیں جو ہندی میں شاعری کر رہے تھے جن میں حضرت بابا فرید (۱۱۷۳۔۱۲۶۷) شیخ شرف الدین بو علی قلندر (۱۳۲۳ وفات) حضرت حمید الدین ناگوری ۱۱۸۳ ۱۲۷۴ اور حضرت یحییٰ منیری (۱۳۷۰ وفات) مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ فہرست کافی طویل ہو سکتی ہے۔ ان سب صوفیا کی شاعری کے نمونے بھی کتابوں میں ملتے ہیں۔[۱]

تیری صدی کے آغاز میں حضرت امیر خسرو ۱۲۳۶ ۱۳۲۴ منظر عام پر آتے ہیں جن کا ہندوی کلام آج بھی قوالوں کی زبان پر ہے گو کہ بعض محققین اس کلام کو الحاقی بتاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ امیر خسرو کے ہندی کلام کی بنیاد زبانی روایت پر ہے لیکن جب تک اس کے خلاف ٹھوس ثبوت فراہم نہیں ہو جاتے ہم اسے رد بھی نہیں کرتے۔

اس عہد میں لکھے گئے صوفیا کے ملفوظات تاریخ کا اہم ماخذ سمجھے جاتے ہیں۔ سیر الاولیا (حضرت امیر خورد) میں ایک واقعہ نقل ہوا ہے۔ جس سے اس زمانہ کی ہندی کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت بابا فرید کی خانقاہ کا ایک منظر ہے۔ ہندوی یہندی زبان میں مکالمہ ہو رہا ہے۔ خواجہ برہان الدین کو ان کے والد خواجہ جمال الدین ہانسوی کی موت کے بعد ان کی خادمہ 'مادر مومنہ' ہانسی سے اجودھن لیجاتی ہے۔ خواجہ برہان الدین ابھی بچہ ہیں۔ بابا فرید انھیں ہانسی کا روحانی پیشوا مقرر کرتے ہیں اس پر خادمہ مادر مومنہ کہتی ہے 'خواجہ برہان الدین

---

[۱] اس عہد کے سلاطین کا طرز فکر ہندی زبان کے فروغ میں معاون ثابت ہو رہا تھا۔ غزنوی اور غوری عہد کے سکوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ہندو اور مسلمانوں کے باہمی ارتباط کی فضا پیدا کی جا رہی تھی جس کی وجہ سے ایک نئی زبان وجود میں آ رہی تھی۔ سلطان محمود غزنوی کے سکہ کے ایک طرف عربی اور دوسری طرف سنسکرت لکھی ہوئی تھی۔ ایک طرف گھوڑسوار کی شبیہہ تھی تو دوسری طرف نندی بیل کی۔ ایک طرف 'سری ہمیر' لکھا ہوتا تھا تو دوسری طرف 'سومنت دیو' یہ دونوں نام سنسکرت رسم الخط میں لکھے ہوتے تھے۔ معز الدین محمد غوری کے سکوں پر تو ایک قدم اور آگے بڑھ کر لکشمی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

بالاہے؛ بابا فرید جواب دیتے ہیں ' مادر مومنہ! پونو (پونم) کا چاند بھی بالا ہوتا ہے'
شاید بعد میں اصلاح کر کے ان جملوں کو زیادہ شستہ بنا دیا ہے۔
ایک اور مثال خیرالمجالس (حضرت نصیرالدین چراغ دہلی) سے نقل کی جاتی ہے
جس سے اس زمانہ کی ہندی کا زیادہ صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک شخص ہے، جو رات و
دن ایک بُت کی پوجا کرتا ہے۔ سالوں سے پوجا کرتا آرہا ہے۔ لیکن کچھ مانگتا نہیں ہے۔
ایک دن وہ بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے اور بُت سے اپنے صحت یاب ہونے کی دعا
مانگتا ہے جو اس طرح سے ہے ؎

"تو میرا گوسائی۔ تو میرا کرتار مجھ اس تپ تے چھُڑا"

صوفیا نے سمع میں فارسی غزلوں کی بجائے ہندی دوہے استعمال کرنا شروع
کر دیے تھے۔ سمع کو صوتی کیرتن بھی کہتے تھے ایک مرتبہ کسی نے بندہ نواز گیسو دراز سے
پوچھا کہ صوفیا ہندوی کو اس درجہ کیوں پسند کرتے ہیں۔ ان کا جواب تھا' کوئی ایک
خوبی ہوتی ہے جو کسی دوسری چیز میں نہیں ہوتی۔ ہندوی نہایت شیریں، نرم و نازک
اور شستہ زبان ہے۔ اس میں اظہار بھی آسان ہے۔ اس کی موسیقی میں سوز و گداز
ہے جو سیدھا دل پر اثر کرتا ہے'۔

ڈاکٹر محمد حسن نے اپنی کتاب "قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ" میں اس ابتدائی
ہندی کی ترقی میں صوفیا کی خدمات کا ذکر کرتے ہوتے اس زمانہ کے ادب میں اس
زبان کے چند نمونے بھی نقل کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "قدیم زمانہ کے جو اردو (ہندی) جملے یا
فقرے ہمیں دستیاب ہوتے ہیں" ان میں سلطان بیگڑھ کا فقرہ 'نیچی بیری سب کوئی
جھورے' اور سلطان سکندر کا جملہ ' برمرا مرید جوگی ہوا'۔ . . شاہ قطب عالم کے
بارے میں مشہور ہے کہ ایک بار رات کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی تو فرمایا "کیا ہے 'لوہا ہے
کہ لکڑ ہے کہ پتھر ہے ؟" محمد حسن نے رحیم سے تقریباً سو سال پہلے کے متعدد صوفیا کا ذکر
کیا ہے اور جن کے ہندی کلام کے نمونے بھی دیے ہیں۔ انھوں نے اس زبان کو
اردو لکھا ہے جب کہ اس زمانہ میں اردو کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ زبان ہندی تھی اور
اردو محققین کی مراد بھی ہندی ہی زبان ہے۔ دراصل یہ زبان ہندی بھی نہیں تھی بلکہ
اس زمانہ میں رائج برج۔ اودھی، راجستھانی وغیرہ کو ہندی والوں نے ہندی کا نام

دیا ہے اور ہم نے محض آسانی کے لیے ہندی لفظ استعمال کیا ہے۔

حضرت امیر خسرو سے تقریباً پچاس سال بعد ملّا داؤد (۱۳۷۰ - ۱۴۵۰) نے مثنوی چنداتن لکھی جس کا ذکر ملّا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ منتخب التواریخ میں بھی کیا ہے جس کے مطابق اس مثنوی کو عہد اکبری میں بھی بہت شہرت حاصل تھی۔ بعد میں چنداتن کے طرز پر بہت سی مثنویاں لکھی گئیں اور یہ سلسلہ انیسویں صدی تک جاری رہتا ہے۔ زیر بحث عہد سے متعلق چند اہم مثنویوں کے نام مع مصنف درج ذیل ہیں۔

۱۔ مرگاوتی قطبن (۱۵۰۱) ۲۔ پدماوت۔ ملک الشعراء ملک محمد جائسی (۱۵۴۰)
۳۔ مدھومالتی۔ منجھن (۱۵۴۵) چتراولی۔ عثمان (۱۶۱۳) ۵۔ گیان دیپ شیخ نبی (۱۶۱۹)۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ سب اعلیٰ پایہ کے صوفی اور باشریعت عالم تھے۔ اپنے زمانہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور کوئی ان کی بھگتی شاعری پر انگلی نہیں اٹھاتا۔ ان کے علاوہ دوسرے قابل ذکر بھکت اور صوفی شعرا میں سرفہرست کبیر (۱۴۷۰ - ۱۵۸۸) اور ان کے ساتھی نرگن شاعروں کی پوری جماعت ہے۔ اس کے بعد ایک اور قابل ذکر صوفی شاعر حضرت عبدالقدوس گنگوہی (۱۴۵۶ - ۱۵۳۷) ہوتے ہیں جو ایک مشہور عالم دین تھے۔ وہ اکبری دربار کے صدر الصدور شیخ عبدالنبی کے نانا تھے۔ کہا جاتا ہے ہر صبح ان کی خانقاہ میں پرابنام (یوگا) ہوتا تھا۔ الکھداس ان کا تخلص تھا۔ رشد نامہ (الکھبانی) کے نام سے ان کے دوہوں کا مجموعہ آج بھی دستیاب ہے۔

اسی زمانہ میں گورونانک (۱۴۶۹ - ۱۵۳۸) ہوتے ہیں جو ہندی شاعری کی اسی روایت کا حصہ تھے اور جن کی بانی میں کھڑی بولی۔ فارسی۔ پنجابی اور برج بھاشا کا حسین امتزاج ملتا ہے اور جو اسلامی تصوف سے بھی متاثر تھے۔

نانک کی موت کے چھ سال بعد دادو دیال (۱۵۴۴ - ۱۶۰۳) پیدا ہوتے ہیں۔ وہ پیدا تو گجرات میں ہوا۔ مگر اس کی زندگی کا بیشتر حصہ راجستھان میں گزرا۔ وہ گجراتی۔ مراٹھی۔ مارواڑی۔ سندھی۔ فارسی اور ہندی سبھی زبانوں میں

شاعری کرتا تھا۔ تاہم اس کی شاعری پر راجستھانی کا زیادہ اثر تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اکبر اور رحیم کا ہم عصر تھا لیکن اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ وہ دونوں میں سے کسی سے ملا بھی کہ نہیں۔ اکبر اور رحیم کے ساتھ دادو کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ اس کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ وہ مسلمان تھا اور اس کا اصل نام داؤد تھا۔

رحیم سے پہلے ہم نے ہندی زبان و ادب کے پس منظر کا مختصر تعارف کرایا تاکہ ہم رحیم کی شاعری کو صحیح سیاق و سباق میں سمجھ سکیں۔ رحیم خلا میں پیدا نہیں ہوا بلکہ چھ سو سال پر پھیلی ہوئی جاندار روایت اس کے سامنے تھی جس پر اس نے اپنی شاعری کا شاندار قصر تعمیر کیا۔

رحیم کی ہندی شاعری کا جائزہ لینے سے پہلے اب اکبری اور جہانگیری درباروں میں ہندی کی صورت حال کا مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

اس عہد میں برج بھاشا ایک فیشن کی زبان تھی جس میں لکھنا پڑھنا قابل فخر سمجھا جاتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ٹوڈرمل نے اگر بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے فارسی کو سرکاری زبان بنانے کی سفارش نہ کی ہوتی تو برج بھاشا مغل دربار کی سرکاری زبان ہوتی۔ یہ بیان مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے تاہم برج بھاشا کی مقبولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ امرا و شہزادے اس زبان میں شعر کہتے تھے۔ خود اکبر سے چند دوہے منسوب کیے جاتے ہیں۔ تزک میں جہانگیر نے دانیال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ہندی میں بھی شعر کہتا تھا۔

غواصی جہانگیر کے دربار کا مشہور شاعر تھا۔ اس نے طوطی نامہ کو جو نثر میں تھا اس طرح نظم کیا کہ ایک مصرعہ فارسی اور دوسرا ہندی میں لکھا۔ فیضی کے ایک دوست ملا نوری ہندی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

ہر کس کہ خیانت کند البتہ ترسد

بیچارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

شیخ محمد شاہ جو فربلی کے نام سے بھی مشہور تھے۔ ہندی کے اچھے شاعر سمجھے جاتے تھے۔ دربار سے ان کا تعلق تھا۔ بادشاہ نے حصار کی جاگیر دے رکھی تھی۔

ایک مرتبہ سفر میں ایک ہندو لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔ اس کی حاضر جوابی سے متاثر ہو کر اسے اپنے ساتھ لے آئے اور اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ انھوں نے اس لڑکی کے ساتھ سوال و جواب کی صورت میں کبت اور دوہے لکھے ہیں۔ ایک دن جب وہ سفر سے لوٹے تو ان کو دیکھ کر لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شیخ نے پوچھا:

"کم ورگ ڈھر سنار۔ مم آیو بھایو نہیں۔

(اے نازنین! تیری آنکھ کیوں آبدیدہ ہوئی۔ کیا میرا آنا پسند نہیں آیا؟)

لڑکی نے برجستہ جواب دیا۔

لیھن نین نکھار۔ لمن ہتی کو درس بن۔

(چونکہ میری آنکھ تمہاری جدائی میں گرد آلود ہو گئی تھی اس لیے میں نے انہیں آنسوؤں سے دھو لیا)

راجہ سورج سنگھ ہندی کے ایک شاعر کو جہانگیر سے متعارف کراتا ہے۔ شاعر ایک اچھوتے مضمون کی نظم بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ بادشاہ خوش ہو کر اسے ہاتھی انعام میں دیتا ہے۔

مقامی ہندو راجاؤں سے رحیم کے اچھے تعلقات تھے۔ اودے پور کے راجہ رانا امر سنگھ اور ریوا کے راجہ رامچندر سے بھی رحیم کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان سے خط و کتابت بھی ہوتی تھی اور مصیبت میں وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے تھے۔ رانا امر سنگھ جہانگیر کی فوجوں کے خوف سے جنگلوں میں چھپا پھرتا تھا۔ اس وقت وہ رحیم کو دوہے لکھ کر بھیجتا ہے اور اس سے مدد کی درخواست کرتا ہے۔ رحیم بھی دوہے میں جواب دیتا اور معذرت کرتا ہے کہ اب خود اس کی حالت ایسی نہیں کہ کسی کی مدد کر سکے۔

رحیم کے دربار میں جہاں فارسی کے بیشمار شاعر ملازم تھے وہاں ہندی کے بھی بہت سے شاعر اس کے خزانہ سے تنخواہ پاتے تھے۔ بقول ملا عبدالخالق نہاوندی جو رحیم کا سوانح نگار تھا۔ جتنے فارسی شاعروں نے رحیم کی تعریف میں قصیدے لکھے۔ اس سے کہیں زیادہ ہندی شاعروں نے اس کی شان میں نظمیں لکھیں۔ راجستھان کا شاعر آس کرن جس کا تخلص 'جاڈا' تھا رحیم کی تعریف میں نظم لکھ کر لاتا ہے جو رحیم کو پسند

آتی ہے اور شاعر کو ایک لاکھ روپیہ انعام میں دینا چاہتا ہے مگر وہ قبول نہیں کرتا۔ اس کے بدلے شاعر اپنے راجہ جگ مل سے بادشاہ کی صلح صفائی کراتا ہے اور راجہ جگ مل کو رحیم بادشاہ سے اس کا کھویا ہوا علاقہ واپس دلا دیتا ہے۔ جہانگیری عہد کا مشہور شاعر کیشو داس جہانگیر چندریکا نام سے کتاب لکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے اس نے یہ کتاب اس وقت لکھی جب رحیم، جہانگیر (سلیم) کا اتالیق تھا اور جو اس نے جہانگیر کی تربیت کے لیے لکھی تھی۔

اُن ہندی کویوں کی فہرست کافی طویل ہے جنھوں نے رحیم کی شان میں قصیدے لکھے ہیں۔ مدن، پرساد، شانتا کوی، ہری ناتھ، نرہری، پرسدھ، سنت، مکند، الاکولی وغیرہ بیشمار نام ہیں جو رحیم کے درباری کوی تھے اور جنھوں نے رحیم کی تعریف میں نظمیں لکھیں۔ ان کا کلام موجود ہے اور کتابوں میں درج ہے۔ رحیم کے ہم عصر شاعروں میں چند نام بہت نمایاں ہیں جیسے سوامی تلسی داس، گنگ کوی، شری کرشن دیوگ اور رودر۔

گنگ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ ایک بلند پایہ شاعر تھا بلکہ اسے رحیم سے زیادہ قربت حاصل تھی۔ وہ اس کا معتمد خاص تھا۔ رحیم نے اسے چھتیس لاکھ روپے انعام میں دیئے تھے۔ جہانگیر بادشاہ نے گنگ کو ہاتھی کے پاؤں تلے کچلوا کر مروا دیا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا قصور کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ رحیم کے ساتھ اس کی دوستی وجہ ہو کیونکہ جہانگیر رحیم سے خوش نہ تھا اور وہ ان کے تعلقات کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ رحیم نے بادشاہ سے گنگ کو معاف کر دینے کی بھی درخواست کی تھی جو مسترد کر دی گئی۔

تلسی اور رحیم کے باہمی تعلقات بتاتے جاتے ہیں۔ رحیم کو قنوج اور جونپور کی جاگیریں ملی تھیں۔ جب وہ وہاں گئے تھے تو راستہ میں بنارس میں تلسی داس سے ملے تھے۔ دونوں میں خط و کتابت بھی تھی۔ قصہ مشہور ہے کہ ایک غریب اپنی لڑکی کی شادی کے لیے امداد مانگنے تلسی داس کے پاس آیا۔ تلسی نے اسے رحیم کے پاس بھیجا اور دوہے کا ایک مصرعہ[1] بھی لکھ بھیجا۔ رحیم نے غریب کو بہت سا دھن دولت دیا اور جواب میں دوہے کا دوسرا مصرعہ[2] لکھ کر تلسی کے پاس بھیجا۔ (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شری کرشن دیوگ اصل میں سنسکرت کے شاعر تھے۔ اس نے ' جاتک پدھتی ادھارن ' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں رحیم کا بھی ذکر کیا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں رودر کوی (۱۶۰۹۔ ۱۶۳۱) نے " خانخانان چرت " کی رچنا کی جس میں رحیم کی شجاعت و سخاوت کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کتاب کا ممدوح و مخاطب رانا پرتاپ شاہ ہے کوی مغل بادشاہ سے جس کی دوستی کرانا چاہتا ہے۔ کتاب کے لکھنے کا مقصد بھی یہی ہے۔ کوی سورج کی تعریف کرتا ہے۔ بادشاہ کو سورج سے تشبیہ دیتا ہے اور خانخاناں میں سورج کی خصوصیات دیکھتا ہے۔ خانخاناں کو وہ کرن ' بھوج ' وکرم جیسے اوتاروں کے نام سے یاد کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ رحیم جب جنگ کا آغاز کرتا ہے تو اس وقت راجاؤں کا تو ذکر ہی کیا سورج بھی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ خانخاناں پرتاپتوں میں سوریہ ہیں۔ لیش میں چندر پر جا کے پتا۔ کرودھی ہوتے پریم راج۔ گنیوں کے لیے کلپدرم۔ ستریوں کے لیے کام دیو۔ پرتیت ہوتے ہیں ؛

ہندی ادب میں رحیم کی شاعری کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔ اس عہد کے چند عظیم شعرا جیسے سور، تلسی، کیشو داس اور کبیر کے ساتھ رحیم کا نام بھی جوڑا جاسکتا ہے۔ وہ کسی طرح بھی ان سے کم نہیں تھے۔ ہندی میں ان پر آج پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جاتے ہیں۔ ان کا کلام نصاب میں داخل ہے۔ ان کے دوہے ضرب المثل بن گئے ہیں۔ اس لیے اس باب میں ان کے کلام کی خصوصیات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

رحیم کی ہندی شاعری کے بارے میں بعض ہندی تنقید نگاروں نے شک وشبہہ کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ رحیم نام کا کوئی دوسرا شاعر تھا جس کا کلام خانخاناں سے منسوب کردیا گیا ہے۔ اس دعوہ کی کوئی بنیاد نہیں اس لیے ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ ہمارے لیے اتنا کافی ہے کہ رحیم کے سوانح نگار

۱ـ सुरतिया नरतिया, नागतीया सब चाहत उप होय ।

۲ـ गोद लिये हु तुलसी फिरै, तुलसी सो सुत होय ॥

عبدالخالق نہاوندی نے اپنی کتاب مآثر رحیمی اور بعد میں مصنف مآثرالامرا نے صاف لکھاہے کہ خانخاناں ہندی میں شاعری کرتا تھااور رحیم ورحیمن تخلص رکھتا تھا۔ تزک میں بھی لکھا ہے کہ وہ فارسی' اور 'ہندی دونوں میں اچھے شعر کہتا تھا'' خانخاناں در قابلیت واستعداد یکتائے روزگار بود وزبان عربی وترکی و فارسی وہندی می دانست واز اقسام دانش عقلی ونقلی حتیٰ علوم ہندی بہرہ وافی داشت وزبان فارسی وہندی شعر نیکو گفتے'' ۔یہ ہمعصر تاریخی شہادت ہے جس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

۔ بادی النظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ مغل فوجوں کا سپہ سالار، ترکی وایرانی روایت وکلچر کا پروردہ رحیم اور ہندی شاعر رحیم سے مختلف ہے۔ یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید وہ دو مختلف افراد ہوں۔ کچھ مسلمان محققین نے اس لیے رحیم کی ہندی شاعری پر شک کیا ہے کہ اس میں رام اور کرشن کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ اور شیخ احمد سرہندیؒ جیسا بزرگ اور صوفی ایسے شخص کی تعریف نہیں کر سکتا لیکن رحیم کی ہندی شاعری کا گہرامطالعہ قطعی طور پر یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اس طرح کی شاعری رحیم کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نہیں کرسکتا تھا۔ ان کے دوہوں میں ان کی زندگی کی تصویر صاف جھلکتی ہے بلکہ بعض دوہے تو صاف صاف ان کی زندگی کے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ رحیم کی رواداری۔ وسعت قلب۔ فراخدلی اور دریا دلی۔ سیاسی زندگی کا ان کا تجربہ۔ حکمت و دانش کی باتیں، ہندو، سنتوں اور مسلمان صوفیوں سے ان کی دوستی۔ اس سب کی جھلکیاں ان کی شاعری میں صاف نظر آتی ہیں۔ جہاں تک رام وکرشن کے تئیں ان کی بھکتی کا سوال ہے تو اس عہد میں مسلمانوں کی بھکتی روایات ایک تسلیم شدہ حقیقت تھی۔ کوئی اس پر ناک بھوں نہیں چڑھاتا۔ مسلمان صوفیا کی طویل فہرست ہے جو رام وکرشن اور ہندی دیوی دیوتاؤں کی شان میں قصیدے لکھتے نظر آتے ہیں لیکن ان کے خلاف کوئی کفر کا فتوا جاری نہیں کرتا۔ ملّا عبدالقادر بدایونی جیسے کٹر اور شمشیر برہنہ شخص نے بھی اس طرح کی شاعری پر کوئی انگلی نہیں اٹھائی۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے کچھ ہندو روایات کو دل سے اپنا لیا تھا۔

۱۹۳۰ء میں ہندی کے مشہور ناقد مایا شنکر یاگنگ نے رحیم کے منتشر کلام کو ایک جگہ مرتب کیا اور ہندی جگت سے ان کی شاعری کا تعارف کرایا۔ یاگنگ کا مرتب کلام رحیم کی شاعری کا کلیات سمجھنا چاہیئے اور جو سب سے زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے کلیات بھی مرتب ہوتے ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

۱۔ رحیمن ونود جسے ہندی ساہتیہ سمیلن نے مرتب کیا ہے ۲۔ رحیم کوتیاولی مرتبہ سریندر ناتھ تیواری۔ ۳۔ رحیمن ولاس مرتبہ برج رتن داس ۴۔ رحیم مرتبہ پنڈت رام نریش ترپاٹھی۔ ۵۔ رحیمن چندریکا مرتبہ رام ناتھ سُمن۔ ۶۔ رحیمن شتک مرتبہ لالہ بھگوان دین۔

II تصانیف

رحیم نے شاعری کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں ایک تصنیف ان سے منسوب کی جاتی ہے جن کا مختصراً ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

دوہاولی

دوہا اس عہد کی سب سے زیادہ مقبول صنف تھی۔ رحیم کو بھی سب سے زیادہ شہرت دوہوں سے ہی ملی۔ دوہا ہندی کی مقبول چھند ہے جس کی اصل اپھرنش ہے دوہے لوک گیتوں میں کافی استعمال کیئے گئے ہیں اور آج بھی فلمی گیتوں میں گاتے جاتے ہیں۔ دوہے کی شکل غزل کے مطلع کی طرح ہوتی ہے۔ دونوں مصرعوں میں ردیف و قافیہ ہوتے ہیں۔ پہلا مصرعہ ۱۳ ماتراؤں پر مشتمل ہوتا ہے اور اسے 'سم' کہتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں ۱۱ ماترائیں ہوتی ہیں اور اسے 'وشم' کہتے ہیں۔

رحیم کے عہد اور ان سے پہلے بہت سے دوہاگو شاعر گزرے ہیں بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ پورے مسلم دور حکومت میں دوہاگوئی کی شاندار روایت ملتی ہے۔ رحیم نے بھی دوہوں کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ تین سو دوہے ان سے منسوب ہیں۔ ہر دوہے میں رحیم یا رحیمن تخلص استعمال ہوا ہے۔ ہندی میں

دوہوں پر مشتمل ست سئی لکھنے کا بھی رواج تھا یعنی سات سو دوہوں کی مکمل کتاب۔ کہتے ہیں رحیم نے بھی ست سئی کی رچنا کی تھی جو اب دستیاب نہیں ہے۔

رحیم کے دوہوں سے اس کی ہندی زبان میں مہارت اور قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ سلاست۔ روانی۔ سادگی اور پرکاری میں یہ دوہے جواب نہیں رکھتے۔ ان میں برج اور کھڑی بولی کا استعمال اثر آفرین ہے۔ رحیم کے دوہے سیدھے دل پر وار کرتے ہیں۔ اس معنی میں وہ کبیر سے بھی آگے ہے۔ اس کے دوہوں میں فارسی، عربی اور سنسکرت کے الفاظ بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ عرفان، بھکتی اور اخلاقیات دوہوں کے موضوع ہیں۔

نگر شوبھا

یعنی شہر کی سجاوٹ نگر اصطلاحاً اس نظم کو کہتے ہیں جو شہر کی تعریف میں ہو اور جس میں شہر کی پیشہ ور عورتوں کے حسن و جمال کی خاص طور پر تعریف کی گئی ہو۔ یہ ایک صنف سخن ہے لیکن رحیم سے اس نام کی ایک کتاب منسوب کی جاتی ہے جو ۱۴۲ دوہوں پر مشتمل ہے۔ اس میں بہت سے دوہوں میں رحیم یا رحیمن کا نام بھی نہیں ہے پھر بھی ان کے مخصوص آہنگ و لہجے کی وجہ سے اسے رحیم کی رچنا تسلیم کر لیا گیا ہے۔ پنڈت مایا شنکر یا گِک نے جو رحیم کے کلام کے مستند عالم ہیں اس کتاب کا ماخذ ایک قدیم مخطوطہ بتایا ہے۔ اس مخطوطہ پر یہ تحریر لکھی ہے۔ "اتھ نگر شوبھا نواب خانخاناں کرت[1]"، (یہ کتاب نواب خانخاناں کی لکھی ہوئی ہے) اس کتاب میں مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والی خواتین جیسے جوہرنی۔ رنگ ریزنی۔ ترکن۔ کیتھن وغیرہ کے حسن و جمال کی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ نگر شوبھا جیسی کتاب لکھنے کی تحریک رحیم کو اکبر کے قلعہ کے مینا بازار سے ملی ہوگی۔ شرنگار رس یعنی حسن کی تعریف میں ہندی ادب کی یہ ایک اہم تخلیق ہے۔

---

[1] ہندی کے زیادہ تر شاعر خانخاناں کو نواب لکھتے ہیں۔

بروے نائکہ بھید

یہ بھی شرنگار رس میں لکھی ہوئی تصنیف ہے جس میں نائک و نائکہ (ہیرو وہیروئن) کی خصوصیات کا ذکر ہے۔ اس میں ۱۱۹ چھند ہیں ایک بروے ہندی کی صنف سخن ہے جسے اودھی کا چھند بتایا گیا ہے[ع۱]۔ رحیم نے بھی اسے اودھی میں لکھا ہے۔ اس صنف کو ہندی ادب میں داخل کرنے کا سہرا رحیم کے سر ہے۔ مایا شنکر یاگگ نے اس کتاب کے کئی مخطوطوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے شروع میں رحیم نے یہ دوہا لکھا ہے۔

کوت کہیو، دوہا کہیو، تُلے نہ چھپے چھند ـــــ درچیو یہ وچار کے یہ بروے رس کند

کہتے ہیں کہ رحیم کا ایک ملازم شادی کے لیے چھٹی لیکر گھر گیا۔ وہ وقت پر ڈیوٹی پر حاضر نہیں ہو سکا۔ اور رحیم کے ڈر کی وجہ سے دربار واپس جانے میں پس و پیش کر رہا تھا۔ اس کی بیوی نے اس کی پریشانی کو بھانپ لیا تھا اور ایک بروے چھند رحیم کے نام لکھ کر دیا جسے پڑھ کر رحیم بہت خوش ہوا۔ نہ صرف ملازم کو معاف کر دیا بلکہ انعام واکرام بھی دیا۔ بروے چھند یہ ہے۔

پریم پریتی کے بروا چلے ہُو لگاتے ـــــ سنچن کی سدھی لیجو مرجھی نہ جاتے

اس چھند سے تحریک پاکر رحیم نے بروے لکھنے شروع کیے۔ کہتے ہیں کہ یہ صنف سخن اودھی میں بڑی مقبول تھی اور اس میں لکھے لوک گیت گھر گھر گاتے جاتے تھے۔ یہ بھی عام خیال ہے کہ سوامی تلسی داس نے "بروے راماتن" کی رچنا رحیم کے کہنے پر ہی کی تھی (اس بیان کے حق میں تاریخی شواہد نہیں ملتے) رحیم نے بروے کو ایک معیاری صنف سخن بنایا اور اس کے ذریعہ انسانی خاکوں کو مجسم کر دیا ہے۔ ایک چھند دیکھتے جو برہا کی آگ میں جل رہی عورت کے بارے میں ہے۔ کہتے ہیں۔ مطلب۔ خوشگوار بادصبا چل رہی ہے۔ مگر محبوب کے بنا تلوار کی طرح لگ رہی ہے۔

ع۱ بروے چھند کے پہلے اور تیسرے مصرعہ میں بارہ بارہ ماترائیں اور دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں سات سات ماترائیں ہوتی ہیں۔

برج رتن داس جنھوں نے رحیمن ولاس مرتب کی ہے رحیم کے بروؤں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ان بروؤں کی زبان اودھی ہے۔ چھوٹے چھوٹے چھندوں میں ہندوستان کی سماجی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ چھند آپ بیتی کی طرح لکھے گئے ہیں۔ یہ چھوٹا سا مجموعہ ہندی ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہے ... جس طرح پدمیں سورداس دوہوں میں بہاری، چوپائیوں میں تلسی اور کوت (کویتا) میں دیو کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا اسی طرح بروؤں میں رحیم کا مدمقابل کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔"

بروے

بروے نائکہ بھید کے علاوہ رحیم کے لکھے پھٹکر بروے بھی ملتے ہیں جن کی تعداد ایک سوایک یا ایک سو پانچ ہے۔ رحیم رتناولی میں انھیں نقل کیا گیا ہے۔ رتناولی کے مصنف یاگک کا کہنا ہے کہ ان بروؤں پر مشتمل ایک مخطوطہ انھیں میواڑ میں ملا تھا۔ رحیم کی ماں کا تعلق بھی میواڑ ہی سے تھا۔ اس لیے یہ نسخہ مستند ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ پریاگ کی میونسپل لائبریری میں بھی ایک نسخہ ملا ہے جس میں رحیم کے لکھے بروے شامل ہیں۔ اس مخطوطہ پر لکھا ہے 'خانخاناں کرت بروے'۔ مختلف مقامات سے جمع کردہ یہ بروے رحیم رتناولی میں یکجا کر دیے گئے ہیں اور مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں اور منگل آچرن چھندوں (بھگتی بھاؤ) پر مشتمل ہیں۔ اپنے موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے یہ رحیم کی دوسری تخلیقات سے مماثلت رکھتے ہیں۔ ابتدائی چھندوں میں بھگوان کرشن۔ سوریہ۔ گنیش وغیرہ دیوتاؤں کی تعریف کی گئی ہے۔ رحیم نے بروؤں میں بارہ ماسہ لکھے ہیں (موسموں۔ اساڑھ۔ ساون۔ بھادوں اور پھاگن کا بیان)، بارہ ماسہ سے متعلق صرف چار چھند ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رحیم انھیں مکمل نہیں کرسکے۔ دوسری تخلیقات میں بھی نامکمل ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ رحیم کی مصروف فوجی زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ بیشتر رچناؤں کو پورا کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔

شرنگار سورٹھا

سورٹھا ہندی اصناف سخن میں دوہے کی تقلیب ہوتا ہے یعنی دوہے کا اُلٹا۔ دوہے کے برعکس اس کا پہلا حصہ وشم اور دوسرا حصہ سم کہلاتا ہے۔ پہلے مصرعہ میں گیارہ ماترائیں اور دوسرے میں تیرہ ماترائیں ہوتی ہیں۔ قافیہ دوہے کے برخلاف درمیان میں یعنی وشم کے بعد ہوتا ہے چونکہ یہاں وشم پہلے آتا ہے۔ کہا جاتا ہے شرنگار سورٹھا کے نام سے رحیم کی ایک علاحدہ تصنیف تھی جو دستیاب نہیں اور اب جس کے صرف سات چھند ملتے ہیں جو رحیم رتناولی میں شامل ہیں۔

مدناشٹک

مدن عشق کے دیوتا کو کہتے ہیں یا وہ شاعری جس میں عشق و محبت کا بیان ہو۔ اشٹک آٹھ کو کہتے ہیں۔ آٹھ عشقیہ بندوں پر مشتمل نظم مدناشٹک کہلاتی ہے۔ رحیم کا مدناشٹک دستیاب ہوا ہے جو کلیات یا رتناولی میں شامل ہے۔ یہ ہندی اور سنسکرت کی قدیم ترین صنف سخن ہے۔ رحیم کے ہم عصر سوامی تلسی داس نے بھی رودراشٹک تحریر کیا تھا۔ رحیم کی یہ تصنیف یا تخلیق سنسکرت شیلی کے مالنی چھند میں لکھی گئی ہے اور کھڑی بولی میں شاعری کی ایک بہترین مثال ہے لیکن جس میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ فارسی اور سنسکرت لفظوں کو ملا کر نظمیں لکھنا ہندی شاعری کی قدیم روایت ہے جس کے پیش رو حضرت امیر خسرو تھے۔ رحیم کے عہد تک یہ روایت چلی آرہی ہے۔ رحیم کے دوہے ہوں یا مدنااشٹک، عربی، فارسی، سنسکرا اور ہندی کے الفاظ کا ملا جلا استعمال ملتا ہے اور زبان کا یہ مشترکہ استعمال اس عہد کا رواج معلوم ہوتا ہے رحیم ہو گنگ یا ہر ہری یا تلسی ہر ایک کے یہاں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ رحیم کے مدناشٹک سے ایک چھند ملاحظہ کیجیے۔

ترل ترنی سی ہیں تیر سی نوکداریں   امل کمل سی ہیں تیر سی نوکداریں
مدھر مدھوپ ہیریں سال مسی نہ راکھیں   دلسی من میرے سندری شیام آنکھیں

زبان و بیان کے اعتبار سے اس شاعری کو رحیم کے ابتدائی دور کی بتایا گیا ہے چونکہ اس میں وہ روانی و پختگی اور سلاست نہیں جو بعد کے کلام میں پائی جاتی ہے کرشن اور رادھا کا پیار کرشن کی بنسی اور گوپیاں مدن ناشٹک کا موضوعات ہیں۔

کھیٹ کوتک جاتکم

سنسکرت زبان میں لکھی گئی یہ تصنیف علم نجوم سے متعلق ہے اور آج بھی دستیاب ہے۔ جس میں فارسی آمیز سنسکرت استعمال کی گئی ہے۔ جاتکم میں کل ۲۳ شلوک بتائے جاتے ہیں جو سیارہ شمس، قمر، عطارد، مشتری، زحل، مریخ وغیرہ کے پھل اور راجیوگ سے متعلق ہیں۔ سنسکرت زبان کے مسلمان شاعروں کے بارے میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں رحیم کی یہ تصنیف بھی شامل ہے۔

پھٹکر

مایا شنکر یاگک نے اس عنوان کے تحت رحیم کے متفرق اشعار جمع کر دیے ہیں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ان میں چار کوت۔ پانچ سویے (سواسو) دو دوہے اور دو پد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ رحیم کے سنسکرت اشلوکوں کا مجموعہ بھی رتناولی میں شامل ہے۔ رتناولی میں شطرنج کے بارے میں رحیم کی لکھی ایک کتاب کا بھی ذکر ہے۔

خصوصیاتِ کلام

رحیم کے دوہوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندی زبان پر غیر معمولی قدرت رکھتا تھا۔ اس کے یہاں زبان کا تخلیقی استعمال پایا جاتا ہے۔ اس طرح کی زبان وہی لکھ سکتا ہے جو ہندی کے علاوہ سنسکرت کے بھی ادبی سرمایہ سے واقف ہو اور غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کا حامل ہو۔ اس کے دوہوں میں صناعی وصنعت گری کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ رحیم اپنی النکار وچھند یوجنا یعنی صنائع بدائع کے استعمال کے لیے مشہور ہے جس کی وجہ سے اسے ہندی ادب میں بلند مقام دیا جاتا ہے۔ اس کے کلام میں تلمیحات تشبیہ واستعارے کی بھرمار

ہے۔ بہت کم دوہے ہیں جن میں تشبیہ اور استعارے نہ ہوں۔ وہ زیادہ تر تلمیحات ہندو اساطیر سے لیتے ہیں۔ اس طرح کی تلمیحات کا استعمال وہی شخص کرسکتا ہے جو ہندو مذہب سے پوری طرح واقف ہو۔ جس نے وید، اپنشد، مہابھارت اور رامائن کا گہرا مطالعہ کیا ہو اور نہ صرف مطالعہ کیا ہو بلکہ ہندو مذہبی روایات کے زیرسایہ پروان چڑھا ہو۔ چھند ودھان کا تعلق عروض سے ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رحیم نے کن کن بحروں اور زمینوں میں دوہے لکھے ہیں۔ یہ پیچیدہ نظام ہے اور نامانوس ہونے کی وجہ سے جس کا سمجھنا مشکل ہے۔ رحیم لفظوں کی تکرار یعنی تنافر لفظی سے صوتی آہنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایہام گوئی اور ذومعنی الفاظ کا استعمال بھی اس کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

رحیم کا رجحان سلیس وسادہ زبان استعمال کرنے کی طرف ہے۔ اس زمانہ میں سنسکرت آمیز ہندی لکھی جاتی تھی۔ مگر رحیم تدسم لفظوں پر تدبھو لفظوں کو ترجیح دیتا ہے۔ یعنی سنسکرت کے اصل الفاظ کی بجائے اس کے یہاں سنسکرت کے وہ الفاظ پائے جاتے ہیں جو کثرت استعمال سے دوسری زبانوں میں آسان وشستہ ہوگئے ہیں۔ عربی وفارسی کے الفاظ بھی کثرت سے استعمال کرتا ہے جیسے زور، مصری، شکل، نصیحت، حضور، کاغذ، بازو، روزی، باز، سزا، خون، خوشی، جہاں، عزت، سلام، نقارہ، دل، درد، سیاہ، فضیحت وغیرہ۔ مگر یہ الفاظ بھی اس کے یہاں ہندی کا حصہ بن گئے ہیں اور غیر مانوس معلوم نہیں ہوتے۔ اس کے دوہوں میں تغزل کا رنگ بھی جھلکتا ہے جو اس عہد کی مقبول ترین صنفِ سخن تھی۔

رحیم کی شاعری کی ایک اور خصوصیت تنوع ہے۔ اس نے بے شمار موضوعات کا اپنے دوہوں میں احاطہ کیا ہے۔ جھونپڑی سے محلوں تک زندگی کی رنگا رنگ جھلکیاں اس کے دوہوں میں پائی جاتی ہیں۔ خود رحیم کی زندگی طرح طرح کے تجربوں سے گزری اس لیے اس کی شاعری میں بھی یہ تنوع در آیا ہے۔ حکمت و دانش کی باتیں بھی اس کے کلام کی ایک خصوصیت ہے جو تجربہ کی آنچ سے ہی جنم لیتی ہیں۔ اس کے بعض دوہوں نے کہاوتوں اور ضرب الامثال کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ اور ان میں پند ونصائح اور اخلاقیات کی تعلیم بھی پائی جاتی ہے۔۔۔

رحیم کی شاعری میں بھگتی کا رنگ غالب ہے جسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ رحیم جو مغل روایات

میں پلا بڑھا اور جس کی تمام زندگی میدان جنگ میں گزری اسے ہندو مذہب کا اتنا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع کیسے ملا ہوگا اور یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید رہیمن یا رحیم نام کا کوئی دوسرا شاعر رہا ہوگا جس کے دوہے خانخاناں سے منسوب کر دیے گئے۔ رحیم کی فارسی شاعری کے کچھ نمونے مآثر رحیمی میں ملتے ہیں جنھیں مع ترجمہ ہم نے اس کتاب میں بھی نقل کیا ہے۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندی والا رحیم کوئی دوسرا شخص ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ بھکتی سے متعلق بیشتر دوہے الحاقی ہیں۔ یہ ہم لکھ چکے ہیں کہ بہت سے بے شمار ہندی اور سنسکرت کے شاعر رحیم سے وابستہ تھے اور انھوں نے اس کی شان میں قصیدے لکھے۔ یہ ممکن ہے کسی شاعر نے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بھکتی دوہے لکھ کر اسے دیے ہوں۔ ہندی کوی گنگ اس کا معتمد خاص تھا۔ رحیم کو ہندی شاعری کی جانب راغب کرنے میں اس کا بڑا دخل تھا۔ رحیم نے اسے اس کے ایک چھپے یا چھوے (چھ بندوں والی نظم) پر ۳۶ لاکھ روپے انعام میں دیے تھے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ رحیم کے بھکتی دوہے اسی کے لکھے ہوئے ہوں۔ یہ تحقیق کا الگ سے موضوع ہے۔ اسی لیے ہم نے رحیم کی ہندی شاعری کے بارے میں جو شک و شبہ پایا جاتا ہے صرف اس کی نشاندہی کی ہے اور اس بحث کو جان بوجھ کر آگے نہیں بڑھایا۔ یہ علاحدہ سے ایک کتاب کا موضوع ہے۔ ہم نے رحیم کی شاعری کا انتخاب اصل دوہوں اور ان کے معنوں کے ساتھ ذیل میں دیا ہے۔ مقصد یہی ہے کہ اردو کا عام قاری رحیم کی ہندی شاعری کی نوعیت سے واقف ہو سکے:۔

करत निपुनई गुन बिना, 'रहिमन' निपुन हजूर ।
मानहुं टेरत बिटप चढ़ि, मोहि समान को कूर ॥

جو لوگ بنا خوبیوں اور قابلیت کے عقلمندوں کے سامنے اپنی تعریف کرتے پھرتے ہیں وہ ایسے ہی ہیں جیسے پیڑ پر چڑھ کر اپنی بے وقوفی کا اعلان کر رہے ہوں

कदली, सीप, भुजंग मुख, स्वाति एक गुन तीन ।
जैसी संगति बैठिए, तैसोई फल दीन ॥

بارش کی ایک بوند کیلے کے پودے پر پڑتی ہے تو کافور بن جاتی ہے وہی بوند سیپ میں گرتی ہے تو موتی بنتی ہے اور سانپ کے منھ میں جانے پر زہر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح صحبت کا اثر ہوتا ہے۔

ए 'रहीम' 'दर-दर फिरहिं, माँगि मधुकरी खाहिं ।
यारो यारी छाँड़िदो, वे 'रहीम' अब नाहिं ॥

آج رحیم در در بھیک مانگ کر گزر کر رہا ہے۔ وہ دن لد گئے۔ وہ رحیم نہیں رہا۔ دوستی چھوڑ دو۔ دوستی جو تم نے اس کے ساتھ کی تھی۔

'राहिमन' मोहिं न सुहाय, अभा पआवै मा बनु ।
बरु वषदेय बुलाय, मान-सहत मरबो भली ॥

بنا عزت کے تو امرت بھی اچھا نہیں لگتا۔ محبت اور عزت کے ساتھ زہر بھی پلایا جائے اچھا لگتا ہے۔ بے عزتی کی زندگی سے عزت کے ساتھ مرنا کہیں بہتر ہے۔

ससि, संकोच, साहस, सलिल, मान, सनेह 'रहीम' ।
बढ़त-बढ़त बढ़ि जात है, घटत-घटत घटि सीम ॥

چاند۔ ہچکچاہٹ۔ ہمّت۔ پانی۔ عزت اور محبت، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو بڑھتے بڑھتے بڑھ جاتی ہیں اور جب گھٹنے پر آتی ہیں بالکل گھٹ جاتی ہیں۔

समय पाय फल होत है, समय पाय झरि जात ।
सदा रहै नहिं एक सी, का 'रहीम' पछितात ॥

کیوں دکھی ہوتے رہتے ہو۔ کیوں پچھتاتے رہتے ہو۔ وقت آتا ہے تو درخت پھلوں سے بھر جاتے ہیں۔ اور پھر ایسا وقت بھی آتا ہے سارے پھل پھول ختم ہو جاتے ہیں۔ وقت کو نہ پہچاننا ہی دکھوں کی جڑ ہے۔

सबै कहावैं लसकरी, सब लसकर कहं जाय ।
'रहिमन' सेल्ह जोई सहै, सोई जगीरै खाय ॥

ہر کوئی فوج میں بھرتی ہونا چاہتا ہے اور فوجی کہلا کر خوشی محسوس کرتا ہے لیکن کامیابی اور نتیجہ میں انعام اسی شخص کو ملتا ہے جو خوشی خوشی تیروں کے وار جھیلتا ہے
(یہ دوہا رحیم کے حسبِ حال ہے)

'रहिमन' देखि बड़ेन को, लघु न दीजिए डारि ।
जहां काम आवै सुई, कहा करै तरवारि ॥

بڑی چیز کو دیکھ کر چھوٹی چیز کو پھینک نہیں دینا چاہیئے۔ تلوار کام آتی ہے تو سوئی کی بھی اہمیت ہے۔ یعنی کوئی بھی چیز بیکار نہیں۔

'रहिमन' जो रहिवो चहै, कहै वाहि के दाव ।
जो बास को निसि कहै, तौ कचपची दिखाव ॥

اگر آقا کو خوش کرنا چاہتے ہو تو ہمیشہ اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہو۔ اگر وہ دن کو رات کہے تو تم کہو نہ صرف رات ہے بلکہ آسمان میں تارے بھی نکلے ہوئے ہیں (یہ دوہا بھی حسب حال ہے)

'रहिमन' छोटे नरन सों, होत बड़ो नहिं काम ।
मढ़ो दमामो ना बने, सौ चूहों के चाम ॥

چھوٹے (دل و دماغ کے) لوگ کوئی بڑا کام نہیں کر پاتے۔ چوہے کی کھال سے نقارہ نہیں بن سکتا۔

'रहिमन' चुप ह्वै बैठिए, देखि दिनन को फेर ।
जब नीके दिन आइहैं, बनत न लगिहैं देर ॥

بُرے دن آنے پر خاموشی اختیار کر لینی چاہیئے، بدقسمتی کا رونا نہیں رونا چاہیئے۔ جب قسمت کروٹ لے گی خود بخود اچھے دن آجائیں گے۔ تم ان دنوں کا انتظار کرو۔

'रहिमन' कहत सु पेट सो, क्यों न भयो तू पीठ ।
रीते अनरीते करै, भरे बिगारत दीठ ॥

رحیمن بار بار پیٹ سے کہتا ہے کہ تو پشت کیوں نہیں ہوا۔ اس لیے کہ اگر تو خالی رہتا ہے تو بُرے کاموں کی طرف راغب کرتا ہے۔

मूढ़मंडली में सुजन, ठहरत नहीं बिसेखि ।
स्याम कचन में सेत ज्यों, दूरी कीजियत देखि ॥

عقلمند آدمی بے وقوفوں کی صحبت میں زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکتا (کیونکہ بیوقوف برداشت بھی نہیں کر سکتے) اور اسے وہ الگ کر دیتے ہیں اسی طرح جیسے کالے بالوں میں سفید بال کو الگ کر دیا جاتا ہے۔

बड़े बड़ाई ना करैं, बड़ो न बोलें बोल ।
'रहिमन' हीरा कब कहै, लाख टका मम मोल ॥

رحیمن! بڑے لوگ اپنے منھ سے اپنی بڑائی نہیں کرتے۔ ہیرا کبھی نہیں کہتا کہ میری قیمت ایک لاکھ روپیہ ہے۔

निज कर क्रिया 'रहीम' कहि, सिधि भावी के हाथ ।
पांसा अपने हाथ में, दांव न अपने हाथ ॥

رحیم ! آدمی عمل ہی کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یا انعام خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ پانسا پھینک سکتا ہے۔ داؤ لگا سکتا ہے۔ ہار جیت اس کے ہاتھ میں نہیں۔

दीन सबन को लखत है, दीनहिं लखे न कोय ।
जो 'रहीम' दीनहिं लखै, दीनबंधु सम होय ॥

غریب سب کی طرف دیکھتا ہے مگر غریب کی طرف کوئی نہیں دیکھتا اور جو شخص غریب کی مدد کرتا ہے وہ واقعی دیوتا کے مانند ہے۔

थोरो किए बड़ेन की, बड़ी बड़ाई होय ।
क्यों 'रहीम' हनुमं को, गिरधर कहत न कोय ॥

اگر بڑا آدمی چھوٹا سا بھی کام کرتا ہے تو ساری دنیا میں اس کا ڈنکا بج جاتا ہے۔ مگر چھوٹا آدمی بڑا کام کر دے تو اس کا نام نہیں لیتے (دیکھو ہنومان درونا چل جیسا پہاڑ اٹھا کر لنکا لے گیا، اس کو کسی نے نہیں پوچھا۔ کرشن نے چھوٹا سا گوردھن پہاڑ اٹھایا، اسے گردھر کا خطاب مل گیا)

तरुवर फल नहिं खात है, सरवर पियहिं न पान ।
कहि 'रहीम' परकाज हित, संपति सँचहिं सुजान ॥

درخت خود اپنا پھل نہیں کھاتے، اور تالاب اپنا پانی نہیں پیتا۔ نیک کام کرنے والی کی بھی ایسی ہی مثال ہے۔ وہ بنا لالچ دوسروں کی بھلائی کے لیے کام کرتا ہے۔

जो 'रहीम' मन हाथ है, तो तन कहूँ किन जाहि ।
जल में जो छाया परे, काया भीजति नाहिं ॥

اگر من پر قابو ہے تو جسم کہیں بھی چلا جائے اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا جس طرح انسان کا سایہ کہ پانی پر پڑتا ہے پر آدمی بھیگتا نہیں ہے۔

जो बड़ेन को लघु कहे, नहिं 'रहीम' घटि जाहिं ।
गिरिधर मुरलीधर कहे, कछु दुख मानत नाहिं ॥

بڑے کو چھوٹا کہنے پر اس کا بڑپن کم نہیں ہوتا۔ گردھر کرشن کو مرلی دھر کہنے پر وہ کہاں چھوٹے ہوتے ہیں۔

जब लगि वित्त न आपुने, तब लगि मित्र न कोय ।
'रहिमन' अंबुज अंबु बिनु, रवि नाहिंन हित होय ॥

کوئی بھی اس وقت تک دوستی نہیں کرتا جب تک اپنے پاس دولت نہ ہو۔ پانی کے بنا سورج کمل سے رشتہ توڑ لیتا ہے۔

छिमा बड़ेन को चाहिए, छोटन को उतपात ।
का 'रहीम' हरि को घट्यो, जो भृगु मारी लात ॥

بڑا آدمی معاف کر دینے سے چھوٹا نہیں ہوتا۔ لڑائی جھگڑا تو چھوٹے لوگ کرتے ہیں۔ مُنی بھرگو نے وشنو کو انجانے میں لات مار دی تھی تو وہ بجائے ناراض ہونے کے بھرگو کے پاؤں چومنے لگے تھے کہ کہیں اس کے پاؤں کو تو چوٹ نہیں لگ گئی۔ اس سے وشنو چھوٹے نہیں ہو گئے۔

गरज आपनी आप सों, 'रहिमन' कही न जाय ।
जैसे कुल की कुलवधू, पर घर जात लजाय ॥

باعزت انسان اپنی غرض کو لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہوا نہیں پھرتا۔ وہ اپنی بات اپنے دل میں رکھتا ہے۔ اچھے گھرانہ کی بہو دوسروں کے دروازہ پر نہیں جاتی۔

कमला थिर न 'रहीम' कहि, यह जानत सब कोय ।
पुरुषपुरातन की बधू, क्यों न चंचला होय ॥

لکشمی (دولت) ایک جگہ نہیں ٹھہرتی۔ بے وقوف ہی یہ سمجھتے ہیں کہ دولت ان کے پاس سے نہیں جائے گی۔

एकै साधे सब सधै, सब साधे सब जाय ।
'रहिमन' भूलहिं सींचिबो,'फूलहि फलहि अघाय ॥

ایک بنیادی کام اچھی طرح پورا کرلو۔ ہر کام میں ہاتھ مت ڈالو۔ ایک درخت کی جڑ پر محنت کرلو تو پھر سارے پھل اور پھول تمہارے ہو جائیں گے۔

आप न काहू काम के, डार पात फल फूल ।
औरन को रोकत फिरैं, 'रहिमन' पेड़ बबूल ॥

ببول کا پیڑ (جو دوسروں کو فائدہ نہیں پہنچاتا) خود اپنے لیے بھی بیکار ہے نہ اس میں پتیاں ہیں اور نہ ڈالیں۔ نہ پھل اور نہ پھول۔ دوسرے پودے بھی اس کے قریب پروان نہیں چڑھتے۔ ایک بیکار آدمی بھی ایسا ہی بے برگ و گیاہ ہوتا ہے۔

वे 'रहीम' नर धन्य हैं, पर उपकारी अंग।
बांटनवारे को लगै, ज्यों मेंहदी को रंग॥

وہ لوگ قابل مبارکباد ہیں جو دوسروں کی فلاح وبہبود میں مصروف رہتے ہیں۔ ایسے لوگ ان مہندی پیسنے والوں کی طرح ہیں کہ جن کے ہاتھ خود بخود رنگ جاتے ہیں۔ یعنی خدمت خلق خود اپنے میں انعام ہے۔

रूप, कथा, पद, चारुपट, कंचन, दोहा, लाल।
ज्यों-ज्यों निरखत सूक्ष्म गति, मोल 'रहीम' बिसाल॥

خوبصورتی، کہانی، شاعری، خوبصورت لباس اور دوہے کی اصل قدر دھیرے دھیرے اور ان کو اچھی طرح سمجھنے پر ہی معلوم ہوتی ہے۔

'रहिमन' वे नर मर चुके, जे कहुं मांगन जाहिं।
उनते पहले वे मुए, जिन मुख निकसत नाहिं॥

رحیمن! ایسے لوگ مر چکے جو کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے جاتے ہیں اور ان سے پہلے وہ مر گئے جن کے منھ سے نا نکلے۔ یعنی وہ مانگنے والے کو منع کر دیں

'रहिमन' लाख भली करो, अगुनी अगुन न जाय।
राग, सुनत पय पिअतहू, सांप सहज धरि खाय॥

رحیمن! خراب آدمی کے ساتھ کتنا ہی اچھا برتاؤ کر لو وہ بُرا ہی رہتا ہے جس طرح سانپ کے سامنے جتنا چاہے بین بجاؤ اور اسے دودھ پلاؤ تب بھی وہ کاٹے ہی گا

'रहिमन' पानी राखिए, बिनु पानी सब सून।
पानी गए न ऊबरै, मोती, मानुष, चून॥

عزت نفس بڑی چیز ہے۔ عزت ہی سب کچھ ہے اور عزت نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ بنا چمک کے موتی بھی بیکار ہوتا ہے۔ اسی طرح بے عزت آدمی بھی بیکار ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کی دوسری مثال اس چونے جیسی ہے جس کا پانی سوکھ گیا ہو۔

'रहिमन' निज मन की बिथा, मनही राखो गोय।
सुनि अठिलैहैं लोग सब, बांटि न लैहैं कोय।

رحیمن! کسی کا دکھ کوئی بانٹ نہیں سکتا۔ اس لیے دوسروں کے سامنے دکھڑا نہیں رونا چاہیئے۔ اس سے مذاق ہی اڑتا ہے۔

आदर घटै नरेस फिग बसे रहै कुछ नाहिं ।
जो 'रहीम' कोटिन मिलै, धिक जीवन जग माहिं ॥

راجہ کی قربت سے بھی عزت کم ہو جاتی ہے اور اس کے باوجود بھی کچھ نہیں ملتا کروڑوں کی دولت بھی ہو تو بنا عزت بیکار ہے۔

अब 'रहीम' मुसकिल पड़ी, गाढ़े दोऊ काम ।
सांचे से तो जग नहीं, झूठे मिलै न राम ॥

رحیم بڑی مشکل آن پڑی ہے۔ سچائی کی راہ اپناتا ہوں تو دنیا نہیں ملتی اور مکر و فریب سے خدا نہیں ملتا۔

अनुचित बचन न मानिए, जदपि गुरायसु गाढ़ि ।
है 'रहीम' रघुनाथ ते, सुजस भरत को बाढ़ि ॥

بڑوں کا بھی وہ حکم نہیں ماننا چاہئے جو غلط ہو۔ مثال۔ رام والد کا حکم مان کر بن کو چلے گئے لیکن بھرت نے گدی پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ یہاں عظمت میں بھرت، رام کے مقابلہ میں بہت بڑھ گئے۔

धनि 'रहीम' जल पंक को, लघु जिय पियत अघाय ।
उदधि बड़ाई कोन है, जगत पियासो जाय ॥

وہ کیچڑ بھی قابل مبارکباد ہے جس میں چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے اس کا پانی پی کر پروان چڑھتے ہیں اس سمندر کی کیا بڑائی کیجئے جس سے سب ہی پیاسے لوٹ آتے ہیں (اچھے برے کا اصل معیار فیض اور بھلائی ہے)

धन थोरो, इज्जत बड़ी, कहि 'रहीम' का बात ।
जैसे कुल की कुलबधु, चियड़न माहिं समात ॥

دولت اگر کم ہے مگر عزت زیادہ ہے تو یہ کوئی برائی کی بات نہیں۔ شریف گھر کی بہو چیتھڑوں میں باعزت رہ سکتی ہے۔

'रहिमन' खोटी आदि को, सो परिनाम लखाय ।
जैसे दीपक सम भखै, कज्जल वमन कराय ॥

جس کام کا آغاز برا، اس کا انجام بھی برا۔ چراغ جلتا ہے تو تاریکی دور ہوتی ہے۔ جب بجھتا ہے تو بھی تاریکی دور کرتا ہے۔

'रहिमन' तब लगि ठहरिए, दान, मान, सनमान ।
घटत मान देखिय जबहिं, तुरतहि करिय पयान ॥

رحیمن ! کسی جگہ پر اسی وقت تک قیام کرنا چاہئے جب تک وہاں عزت اور احترام ملے اور خاطر تواضع ہو۔ جب یہ محسوس ہو کہ ان چیزوں میں کمی ہو رہی ہے تو وہاں سے چل دینا چاہئے۔

'रहिमन' जिह्वा बावीर, कहिगी सरग पताल ।
आपु तो कहि भीतर रही, जूती खात कपाल ।

اس پاگل زبان کو کیا کیجئے جو اُلٹا سیدھا بک کر خود تو اندر چلی جاتی ہے اور آدمی کو جوتیاں کھانی پڑتی ہیں۔

'रहिमन' अब से बिरछ कहें, जिनकी छाँह गंभीर ।
बागन बिच-बिच देखिअत, सेंहुड़ कुंज करीर ॥

رحیمن ! اب وہ ہرے بھرے پیڑ کہاں جن کے سایے کبھی گھنے ہوتے تھے۔ اب تو وہاں جھاڑیاں ہیں۔ ویرانہ ہے (اپنے برے وقت کو یاد کرتا ہے)

जिहि अंचल दीपक दुर्‍यो, हन्यो सो ताही गात ।
'रहिमन' असमय के परे, मित्र सत्रु ह्वै जात ॥

ایک عورت جس چراغ کی حفاظت اپنی ساڑی کے آنچل سے کرتی ہے، چراغ اسی آنچل کو جلا بھی دیتا ہے۔ برا وقت آنے پر دوست بھی ساتھ چھوڑ دیتا۔

जैसी जाकी बुद्धि है, तैसी कहै बनाय ।
ताको बुरो न मानिये , लेन कहाँ सूँ जाय ॥

جتنی جس کی عقل ہوتی ہے ویسی ہی وہ بات کرتا ہے۔ ہمیں ایسے شخص کی بات کا برا نہیں ماننا چاہئے کیونکہ وہ عقل کہاں سے لائے۔

जो 'रहीम' ओछो बढ़ै, तो अति ही इतराय ।
प्यादे से फरजी भयो, टेढ़ो-टेढ़ो जाय ॥

اگر کوئی کم ظرف یا کمینہ آدمی ترقی کر جاتا ہے تو وہ اِتراتا پھرتا ہے اور مغرور ہو جاتا ہے۔ جیسے شطرنج کے کھیل میں جب پیادہ فرزین بن جاتا ہے تو ٹیڑھی چال چلنے لگتا ہے۔

सब कोऊ सबसों करें, राम जुहार सलाम ।
हित अनहित तब जानिये, जा दिन अटके काम ॥

یوں تو سبھی اچھی طرح ملتے ہیں مگر دوست دشمن کا پتہ واسطہ پڑنے سے ہی معلوم ہوتا ہے۔

'रहिमन' वहाँ न जाइये, जहां कपट को हेत।
हम तो दारत ढेकुली, सींचत अपनो खेत॥

رحیمن! ایسی جگہ کبھی نہیں جانا چاہئے جہاں جھوٹ اور فریب سے لوگ کام نکالنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ مفت کے پانی سے اپنے کھیت سینچتے ہیں۔

सदा नगारा कूच का, बाजत आठों जाम।
'रहिमन' या जग आइकै, को करि रहा मुकाम॥

آٹھوں پہر موت سر پر منڈالتی رہتی ہے۔ ہر دم موت پکار رہی ہے نہ جانے کب کس کا وقت آجائے۔ زندگی فانی ہے۔

बिन्दु में सिन्धु समान, जो अचरज कासों कहैं।
हेरनहार हिरान, 'रहिमन' आपुनि आपमें॥

تعجب کی بات ہے۔ کس سے کوئی کیا کہے۔ ایک بوند میں سمندر سما گیا۔ (سچائی کی)، جو تلاش میں نکلا تھا وہ خود ہی گم ہو گیا۔

ते रहीम मन आपनों कीन्हो चारू चकोर।
निसि वासर लागो रहै कृष्ण चनद्र की ओर॥

اے رحیم! اپنے من کو چکور کی طرح بنا لے اور رات و دن چاند روپی (کرشن) کی ہی طرف لگا رہے۔

गहि शरणागत राम की भवसागर की नाव।
रहिमन जगत उधार करि और न कछू उपाव॥

اے رحیمن! اگر تو دنیا روپی سمندر کو آسانی سے پار کرنا چاہتا ہے تو رام سے لو لگانے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے۔

शरत निशि निशीथे चांद की रोशनाई।
सघन बन निकुंजे कान्ह बंसी बजाई॥
रतिपति सुत निद्रा साइयां छोड़ भागी।
मदन शिरसि भूयः क्या बला आन लागी॥

شرد رت کی رات میں چاندنی چٹکی ہوتی ہے بن کی کنجوں میں کانہا (کرشن) بنسری بجا رہا ہے۔ گوپیاں گھر بار اور بچے چھوڑ دوڑیں۔ او مدن! تو نے یہ کس

پریشانی میں ڈال دیا ہے۔

रत्नाकरोस्ति सदनं गृहिणी च पद्मा ।
किं देयमस्ति भवते जगदीश्वराय ॥
राधागृहीतमनसे मनसे च तुभ्यं ।
दत्तं मया निजमनस्तदिदं गृहाण ॥

رتناکر (سمندر) تمہارا گھر ہے۔ پرما جو مقدر کی دیوی ہے تمہاری بیوی ہے اور دنیا کے مالک! میں تجھے کیا دوں؟ میں اپنا دل ہی دے سکتا ہوں۔ جس طرح تیرا دل پہلے سے رادھا نے لے رکھا ہے۔ (سنسکرت)

छवि आवन मोहन लाल की ।
काछे काछनि कलित मुरलि कर पीत पिछोरी लाल की ॥
बंक तिलक कैसर को कीने दुति मानो विधु बाल की ॥
बिसरत नाहिं सखी मो मन ते चितवनि नयम विसाल की ॥
नीकी हंसनि अधर सधरनि की छवि छीनी सुमन गुलाल की ॥
जल सों डारि दियो पुरइन बन डालनि मुकुतामाल की ॥
आप मोल बिन मोलनि डोलनि बोलनि मदन गोपाल की ॥
यह सरूप निरखे सोइ जाने इस रहीम के हाल की ॥

اس چھند میں کرشن جی کا سراپا کھینچا ہے۔ ہندی میں پیکر تراشی کا یہ ایک نمونہ ہے۔ کرشن کی مرلی، پیتامبر، آنکھوں کی چیتون، دانتوں کی چمک، شہد سے زیادہ شیریں باتیں، موتیوں کی مالا، کرشن ایک حسن کا مجسمہ ہے۔ وہ ایک پیکر جو ورندابن سے برج کو آتا جاتا ہے۔ اس پر نظر ٹھہرتی نہیں ہے۔ گوپیاں کرشن کے اس حسن کو بھول نہیں پاتیں خاص طور پر ان کی بانکی چیتون کو۔

रहिमन बात अगम्य की, कहन सुनन की नाहिं ।
जे जानत ते कहत नहिं, कहत ते जानत नाहिं ॥

خدا کو جاننے کے لیے کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ اس کا گیان تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جو جانتے ہیں وہ کہتے نہیں جو کہتے ہیں وہ اس کو جانتے نہیں۔

जो गरीब पर हित करैं, ते रहीन बड़ लोग ।
कहां सुदामा बापुरो, कृष्ण मिताई जोग ॥

کرشن سداما کی دوستی مشہور ہے۔ جو لوگ غریب پر مہربانی کرتے ہیں وہی

لوگ بڑے ہوتے ہیں۔ جیسے کرشن کی مثال ہے۔ کہاں غریب سداما کہاں کرشن۔

दुख मे सुमिरन सब करै, सुख मे करे न कोय।
जो सुख मे सुमिरन करै, दुख काहे को होय॥

خدا کو دکھ میں تو سبھی یاد کرتے ہیں، بات تو تب ہے جب سکھ میں بھی اسے یاد کر سکھ میں اگر اسے یاد کرتا تو پھر دکھ کیوں ہوتے۔

आए राम रहीम कवि, किए जती को भेष।
जाको विपदा परति है, सो कटती तुवंदेस॥

رحیم شاعر نے سنیاسی کا بھیس بنالیا ہے: جب انسان پر مصیبت آتی ہے تو وہ خدا کی طرف دوڑتا ہے۔ رحیم نے بھی خدا کی طرف اپنی مصیبت دور کرنے کے لیے لو لگالی ہے۔

रहिमन मांगत बड़ेन की लघुता होत अनूप।
बलि मख मांगन को गए धरि बावन को रूप॥

مانگنے سے بڑا آدمی بھی چھوٹا ہو جاتا ہے۔ مانگنے سے خودداری کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ شاعر نے پھر پرانوں کے ایک قصہ بلی اور باون کی طرف اشارہ کیا ہے جو ایک تلمیح ہے بھگوان نے مانگنے والے بونے کا روپ دھارن کیا تھا۔

खैर, खून, खांसी, खुसी, बैर, प्रीति, मदपान।
रहिमन दाबे न दबै, जानत सकल जहान॥

رحیم کہتے ہیں، بھلائی، خون، کھانسی، خوشی، دشمنی، شراب نوشی اور محبت چھپائے سے بھی نہیں چھپتے۔ سارا جہاں اس کو جان لیتا ہے۔

रहिमन मारग प्रेम को, मत मतिहीन मझाव।
जो डिगि है तो फिर कहूं नहिं धरतने को पांव॥

ہاں یہ محبت کی راہ ہے۔ محبت کی راہ پر بے وقوف نہیں چل سکتا۔ وہ تو قدم قدم پر ٹھوکر کھائے گا اور اس راہ میں ایک بار پاؤں پھسلا اور گیا۔

जे सुलगे ते बुझि गए, बुझे ते सुलगे नाहिं।
रहिमन दाहे प्रेम के बुझि के सुलगाहिं॥

محبت کی دنیا بھی عجیب و غریب ہوتی ہے۔ عام طور پر جب آگ بجھ جاتی

ہے تو پھر جلتی نہیں۔ یہاں محبت کی آگ بار بار بجھ کر بھی جل اٹھتی ہے

प्रीतम छवि नैनन बसी, पर छवि कहां समाय।
भरी सराय रहीम लखि, पथिव आप फिरि जाय॥

محبت دوئی کو برداشت نہیں کرتی۔ آنکھوں میں ایک بار محبوب کی تصویر بسی تو پھر دوسری تصویر نہیں سما سکتی۔ جس طرح سرائے بھری دیکھ کر مسافر واپس لوٹ جاتا ہے۔

यों रहीम सुख दुःख सहत, बड़े लोग सहि सांति।
उवत चन्द जिहि भांति सों, अथवत ताहि भांति॥

بڑا آدمی ہمیشہ بڑا ہی ہوتا ہے۔ وہ دکھ سکھ میں اپنے بڑپن کو نہیں کھوتا جس طرح سورج اور چاند، طلوع اور غروب دونوں وقت لال ہی رہتے ہیں۔

ओछेको सतसंग, रहिमन तजहु अंगार ज्यों।
तातो जारे अंग, सीरे पै कारो करे॥

اوچھے یا کمینے شخص سے دور ہی رہو۔ اس کی دوستی اچھی نہ دشمنی۔ اس سے نقصان ہی پہنچتا ہے جیسے کوئلہ گرم ہو تو ہاتھ جلاتا ہے۔ ٹھنڈا ہو تو کالا کرتا ہے۔

धनि रहीम जलकूप को, लघु जिय पियल अधाय।
उदधि बड़ाई कौन है, जगत पियालों जाय॥

سمندر اتنا وسیع و عریض ہے۔ مگر اس سے کیا فائدہ۔ اس سے تو وہ کنواں اچھا ہے جو انسان کی پیاس تو بجھا سکتا ہے۔

जो रहीम उत्तम प्रकृति, का करि सकत कुसंग।
चन्दन विष व्यापत नहीं, लपटे रहत भुजंग॥

جو شریف النسل انسان ہے اس پر بری صحبت بھی خراب اثر نہیں ڈال سکتی۔ صندل کے پیڑ پر سانپوں کا بسیرا رہتا ہے مگر صندل پھر بھی زہریلا نہیں ہوتا۔

बस कुसंग चाहत कुसल, यह रहीम जिय सोस।
महिमा घटो समुद्र की, रावन बस्यो परोस॥

خراب آدمی کے ساتھ تعلق منقطع کر دو۔ اس کا ساتھ مصیبت کا ہی باعث ہوتا ہے اور سمندر کا بڑپن کم ہو گیا راون کے پڑوس میں ہونے کی وجہ سے (تلمیح)

यह न रहीम सराहिए, देन लेन की प्रीत ।
प्रानन बाजी राखिए, हारि होय के जीत ॥

اے رحیم! محبت میں لین دین کی بات مت کر۔ محبت قربانی چاہتی ہے۔ انسان محبت میں فنا ہو جاتا ہے۔ محبت میں ہار اور جیت کا بھی سوال نہیں۔

जलहि मिलाय रहीम ज्यों, कियो अपा सम छीर ।
अंगवहि आबहि आप त्यों, सकल आंच की भीर ॥

محبت میں وصال بھی بے معنی ہے۔ شاعر دودھ اور پانی کی مثال دیتا ہے کہ پانی دودھ میں مل کر دودھ جیسا یعنی ایک رنگ ہو جاتا ہے مگر دودھ جب آنچ پر رکھا جاتا ہے اور پانی کے اس میں تحلیل (وصل) ہونے کا وقت آتا ہے تو پانی (محبوب) ہوا میں اڑ جاتا ہے۔ قربانی کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

जाल परे जल जात बहि, तजि मीनन को मोह ।
रहिमन मछरी नेह को तऊ न छाड़त छोह ।

سچی محبت یک طرفہ ہوتی ہے۔ محبوب یہ نہیں دیکھتا یا مانگ کرتا کہ اس کی محبوبہ بھی اسی کی طرح قربانی دے۔ یا وہ بھی اس سے اسی طرح پریم کرے جیسے وہ خود کرتا ہے۔ مچھلی کا پانی سے پریم اس اعتبار سے مثالی ہے کہ وہ جیسے ہی پانی سے الگ ہوتی ہے، اپنی جان دے دیتی ہے۔

धनि रहीम गति मीन की, जल बिछुरत जिय जातय ।
जियत कंज तजि अनत बसि, कहा भौंरे को जाय ॥

ہر کسی کی محبت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ مچھلی کی محبت بھنورے کی محبت سے الگ ہوتی ہے۔ مچھلی پانی سے جدا ہو کر جان دے دیتی ہے جبکہ بھنورا ایک کمل کو چھوڑ کر دوسرے میں جا بستا ہے۔

रहिमन प्रीति न कीजिए, जस खीरा ने कौन ।
ऊपर से तो दिल मिला, भीतर फांके तीन ॥

محبت تو بے لوث اور بے غرض ہی ہوتی ہے۔ اس میں ریاکاری نہیں چلتی کھیرے کی طرح کہ اوپر سے صاف اور اندر سے تین پھانکیں۔

कबहुंक खग मृग मीन कबहुं मर्कट तन धरिके ।
कबहुंक सुर नर असुर नाग भेस आकृति करिके ॥

کبھی پرند، ہرن، کبھی مچھلی، کبھی بندر کا روپ دھارن کرتا ہے۔ کبھی دیوتا۔
انسان۔ راکشس اور ناگ کے روپ میں اوتار لیتا ہے (اس سے معلوم
ہوتا ہے رحیم تناسخ میں یقین رکھتا تھا۔

अंतर दाव लगी रहै, धुंआ न प्रगटे सोय ।
कै जिय जाने आपनों, जा सिर बीती होय ॥

محبت میں انسان اندر ہی اندر گھٹتا رہتا ہے۔ جس دھواں کے باہر
نہ نکلنے سے گھٹن ہوتی ہے۔ یہی حالت پریمی کی ہوتی ہے جس پر گزری ہے
وہی جانتا ہے۔

काह करौं बैकुन्ठ लै, कल्पबृछ्छ की छांह ।
रहिमन ढाक सुहावनो, जो गल प्रीतम बांह ॥

جنت کو لے کر کیا کروں گا۔ کیا کلپ کے پیڑ کا سایہ۔ مجھے تو ڈھاک کے
پتّے اچھے لگتے ہیں جو محبوب کی باہوں میں ہیں۔

सीखे कहां नवाबजू, ऐसी देनी देन ।
ज्यों ज्यों कर ऊंचो करो, त्यों त्यों नीचे नैन ॥

کوی گنگ: نواب خانخاناں نے بخشش کے ایسے دلنواز انداز کہاں سے سیکھے ہیں کہ
جتنا اس کا ہاتھ دینے کے لیے اونچا اٹھتا جاتا ہے یعنی زیادہ سے زیادہ
خیرات کرتا ہے اتنی ہی اس کی نگاہیں نیچے جھکتی جاتی ہیں۔

देनहार कोउ और है, भेजत सो दिन रैन ।
लोग भरत हम पर धरैं, याते नीचे नैन ॥

رحیم کا جواب: دینے والا تو کوئی اور ہے جو بھیجتا رہتا ہے ان ہاتھوں کے لیے ہم پر تو
دینے کا الزام ہے۔ اس لیے خیرات کرتے وقت شرم سے میری نگاہیں خود
بخود نیچی ہو جاتی ہیں۔

خلاصہ

عبدالرحیم خانخاناں ۱۷ دسمبر ۱۵۵۶ء کو لاہور میں پیدا ہوا تھا وہ اکبر کے پہلے وکیل بیرم خاں کا بیٹا تھا جو قوۃ قراقونلو ترکمان کی ایک شاخ بہارلو سے تعلق رکھتا تھا۔ اِس کی ماں جمال خاں میواتی کی بیٹی تھی جس کی بڑی بہن سے شہنشاہ ہمایوں کی شادی ہوئی تھی۔ وہ چار سال کا تھا اس کے باپ کا قتل ہوگیا۔ اکبر نے خود اس کی پرورش کی اور اعلیٰ تعلیم و تربیت دلائی۔ اکبر ہی سے اُس نے میرزا خاں کا لقب پایا ۱۵۷۲ء میں وہ اکبر کے ہمراہ گجرات گیا۔ بعد ازاں سید احمد بارہ کی اتالیقی میں ضلع پٹن کا حاکم بنا دیا گیا جہاں اس کا باپ قتل ہوا تھا۔

(اگست ۱۵۷۳ء) میں جب اکبر گجرات پر اپنی عاملانہ تاریخی یلغار کرنے پر مجبور ہوا تو وہ بھی اس کا ہمرکاب تھا۔ سرنال کی جنگ میں جس میں باغی میرزاؤں کا استحصال کیا گیا۔ قلب لشکر کی قیادت میں وہ بھی شریک تھا ۱۵۷۶ء میں اسے گجرات کا والی مقرر کیا گیا۔ لیکن صوبہ کے نظم و نسق کو فی الواقع سنبھالنے کا کام وزیر خاں ہروی کے سپرد ہوئی۔ اِسی سال سے میواڑ کی مہم پر بھیجا گیا ۱۵۷۸ء میں اس نے گولکنڈہ اور کمبھل میر کو فتح کرنے میں حصہ لیا۔ ۱۵۸۱ء میں شہنشاہ اکبر نے اُس پر عظیم اعتماد کے طور پر اسے "میر عرض" کے عہدے پر مامور کر دیا۔ اِس سے پہلے اس منصب کے فرائض سات منصب دار ملکر انجام دیا کرتے تھے۔ اسے رنتھبور کی جاگیر بھی عطا ہوئی اور اُس علاقے میں امن و امان قائم کرنے کا حکم دیا گیا۔ ۱۵۸۲ء میں وہ اکبر کے بیٹے سلیم کا اتالیق مقرر ہوا جو اس وقت تیرہ سال کا تھا ۱۵۸۳ء میں اسے مظفر شاہ گجراتی کی بغاوت کو فرو کرنے کی خدمت تفویض ہوئی۔

اس نے جنوری ۱۵۸۴ء میں مظفر کی زبردست طاقت کو سرکھیج اور
ناڈیڈ کی جنگوں میں کچل ڈالا۔ اس کی فاتحانہ خدمت کے اعتراف کے طور پر
اسے "خانخاناں" کا لقب ملا۔ اور اس وقت کا سب سے بڑا منصب پنج ہزاری
بھی عطا ہوا۔ گجرات کی کمان اسی کی تحویل میں رہی۔ اُس نے کاٹھیاواڑ میں مظفر کا تعاقب
کیا۔ ۱۵۸۵ء میں نواں نگر کو مسخر کر لیا۔ ۱۵۸۵ میں جب خانخاناں دربار شاہی
میں حاضری دینے کے لیے گیا تو اُس کی عارضی غیر حاضری کے دوران میں مظفر نے
پھر بغاوت کا علم بلند کر دیا، چنانچہ خانخاناں فوراً واپس آگیا اور صوبے میں دوبارہ
امن قائم کیا۔ اگلے سال جب مشترکہ ولایت کا طریقہ رائج کیا گیا تو قلیج خاں کو اس
کا شریک بنا دیا گیا۔ ۱۵۸۷ء میں اُسے دربار شاہی میں رہنے کی اجازت مل گئی۔
اگرچہ گجرات کا برائے نام والی وہی رہا۔ ۱۵۹۹ء میں گجرات کا صوبہ اس کی تحویل
سے لے کر اس کی بیوی ماہ بانو کے بھائی مرزا عزیز کوکہ کے حوالے کر دیا گیا۔

اسی سال وہ دربار شاہی کے اعلیٰ منصب پر فائز ہوا اور شہنشاہ کا وکیل
بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے جونپور کی جاگیر عطا ہوئی۔ اسی سال اس نے شہنشاہ
کی خدمت میں بابرنامہ کا فارسی میں ترجمہ کیا جو واقعات بابری کے عنوان سے کیا
تھا۔ پیش کیا۔ ۹۱-۱۵۹۰ء میں اسے اس کی خواہش کے خلاف جونپور کی بجائے
ملتان اور بھکر کی جاگیر عطا ہوئی اور اس فوج کا سالار بنا دیا گیا جو قندھار اور
ٹھٹھے کا راستہ روکنے کی غرض سے بھیجی گئی تھی۔ اس وقت ٹھٹھے پر جانی بیگ ترخان
قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ عبدالرحیم نے قندھار پر چڑھائی کرنے
کی بجائے زیادہ مال غنیمت حاصل کرنے کے خیال سے ٹھٹھے کا رخ کر لیا بنابریں
قندھار کی مہم اکبر کے بیٹے دانیال کے حوالے کر دی گئی۔ ۹۱-۱۵۹۲ء میں ٹھٹھ کی
فتح پایہ تکمیل کو پہنچی۔ میرزا جانی بیگ نے اپنی بیٹی عبدالرحیم خاں کے بیٹے شاہ نواز
خاں (ایرج) کو بیاہ دی اور عبدالرحیم کے ساتھ دربار شاہی میں چلا آیا۔

۱۵۹۳ء میں اُسے شہزادہ دانیال کی مدد پر مامور کیا گیا۔ جسے دکن کی قیادت
دی گئی تھی۔ لیکن عبدالرحیم کے مشورے پر یہ مہم منسوخ کر دی گئی۔ دو سال بعد جب
دکن کی تسخیر کا کام ایک دوسرے شہزادہ مراد کے سپرد کیا گیا تو عبدالرحیم کو بھلسہ

کی جاگیر عطا ہوئی اور شہزادے کی مدد کرنے کا حکم ملا۔ اس کے بعد مختصر سے وقفوں کو چھوڑ کر تقریباً بتیس سال تک وہ دکن ہی میں مامور رہا۔ چونکہ خانخاناں نے شہزادہ مراد کے یہاں جانے میں دیر کر دی تھی اس لیے مراد اس سے بد خُلقی سے پیش آیا، چنانچہ اس نے معرکہ میں پُر جوش حصہ نہ لیا۔ بہرکیف، ایک موقع پر اس نے کچھ سرگرمی دکھائی اور وہ اس طرح کہ بیجاپور کے سہیل خاں کی فوج کو جو اس کی فوج سے تعداد میں زیادہ تھی ۱۵۹۷ء میں ایک اہم لڑائی میں شکست دی۔ شہزادہ کے ساتھ اس کے تعلقات کشیدہ ہی رہے، تاآنکہ ۱۵۹۸ء میں اسے دکن سے واپس بلا لیا گیا۔

۱۵۹۹ء میں مراد فوت ہوگیا اور دکن میں دانیال مامور ہوا۔ عبدالرحیم کو حکم ملا کہ وہ دانیال کے ساتھ مل کر احمد نگر کا محاصرہ کرے، جس کی مدافعت میں چاند بی بی بڑی شجاعت و ہمت کے ساتھ جان لڑا رہی تھی۔ احمد نگر کی فتح کے بعد دانیال اس کی صوبیداری پر مامور ہوا اور عبدالرحیم کی بیٹی جانا بیگم سے اس کی شادی کر دی گئی پھر عبدالرحیم کو احمد نگر جانے اور اس علاقے میں امن قائم کرنے کا حکم ملا اور اگلے سال اسے برار، پتھری اور تلنگانہ کی سپہ سالاری بھی مل گئی۔

جب شہزادہ سلیم، جہانگیر کا لقب اختیار کر کے تخت پر بیٹھا تو دکن میں تھا۔ نئے شہنشاہ نے اسے اپنے منصب پر بحال رکھا اور اسے مزید تسلی دینے کے لیے مقرب خاں کو خصوصی طور پر اس کے پاس بھیجا۔ جب احمد نگر کے نظام شاہی خاندان کے سپہ سالار ملک عنبر نے ان علاقوں کو جن پر مغل قابض ہو گئے تھے۔ از سرِ نو حاصل کرنے کے لیے دلیرانہ اقدام شروع کیے تو عبدالرحیم نے شہنشاہ کی خدمت میں عرض کی کہ اگر مجھے کمک دی جائے تو میں فوراً اس فتنے کو کچل سکتا ہوں۔ چنانچہ جہانگیر کے بیٹے پرویز خاں کی قیادت میں ایک لشکر جرار عبدالرحیم کی مدد کے لیے بھیجا گیا لیکن فوجی سالاروں میں اتحادِ عمل نہ ہونے کی وجہ سے عبدالرحیم ۱۶۱۰ء میں ملک عنبر سے ایک ذلت آمیز معاہدہ طے کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ چنانچہ اسے بطور اہانت واپس بلا لیا گیا اور بدانتظامی اور غداری کے الزامات اِس پر لگائے گئے۔ بہرحال جلد ہی اِس کا قصور معاف کر دیا گیا۔ اسے کا اور قنوج کی جاگیریں عطا ہوئیں اور ان

علاقوں میں بغاوت کو دبانے کی خدمت تفویض ہوئی۔ دکن میں مغلوں کی قسمت کا ستارہ چمکا نہیں تھا' اس لئے ۱۶۱۲ء میں عبدالرحیم کو پھر دکن کی مہمات پر مامور کیا گیا۔ لیکن وہ صورت حال کو کسی حد تک سنبھال لینے سے زیادہ کچھ نہ کرسکا حتیٰ کہ ۱۶۱۶ء میں شہزادہ پرویز کو واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ شہزادہ خرم (بعد میں شہنشاہ شاہجہاں) کو لشکر جرار کے ساتھ دکن کی طرف بھیجا گیا۔ ملک عنبر کو شکست ہوئی اور اس نے ۱۶۱۷ء میں ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے مغلوں کے تمام علاقے انھیں لوٹا دیے گئے۔ ۱۶۲۰ء میں اس نے مغلوں کے علاقوں پر حملہ کیا اور شاہجہاں کے ہاتھوں پھر شکست کھائی۔ ۱۶۲۲ء میں شاہجہاں کو عبدالرحیم کے ساتھ دکن سے واپس طلب کیا گیا اور اسے ایرانیوں کے خلاف ایک لشکر کی قیادت سونپی گئی۔ قندھار فتح کر لیا تھا۔ شاہجہاں نے یہ حکم ماننے سے انکار کرتے ہوئے بغاوت کا علم بلند کیا۔ عبدالرحیم بھی اس کے ساتھ تھا یعنی اس کا ساتھ دیا شاہی سپہ سالار مہابت خاں سے راہ و رسم پیدا کرنے کی وجہ سے شاہجہاں نے اسے گرفتار کر لیا لیکن جب مہابت خاں نے صلح کی شرائط طے کرنے پر اصرار کیا تو اسے رہا کر دیا گیا۔ جب وہ شاہی افواج کے کیمپ میں پہنچا تو باغی افواج سے اس کا سلسلہ رسل و رسائل منقطع کر دیا گیا۔ اگرچہ اس نے شاہی فریق کا ساتھ دینے پر رضامندی ظاہر کی، تاہم اسے حراست میں رکھا گیا۔

۱۶۲۵ء میں جہانگیر نے اسے اپنے دربار میں بلا لیا۔ اور اس کے القاب و آداب بحال کر کے ایک لاکھ روپیہ انعام دیا۔ جب شہنشاہ نے مہابت خاں کی حراست سے، جو باغی ہو گیا تھا' رہائی حاصل کی تو عبدالرحیم نے درخواست پیش کی کہ اسے باغی سالار کے مقابلے میں مہم لے جانے پر مامور کیا جاتے ۱۶۲۳ء میں اسے مہم کی تیاری کے احکام ملے اور اسے وہ تمام جاگیریں دیدی گئیں جو پہلے مہابت خاں کی تحویل میں تھیں۔ ابھی یہ تیاریاں تشنۂ تکمیل ہی تھیں کہ وہ لاہور میں بیمار پڑ گیا۔ اور ۱۰۳۶ھ ۱۶۲۷ء میں دہلی پہنچ کر اکھتر (۷۱)، کی عمر میں وفات پائی۔ اس کا مزار شیخ نظام الدین اولیا کے مزار کے قریب آج بھی موجود ہے۔ اس کے چار بیٹے اس کی زندگی ہی میں فوت ہو چکے تھے (۱) میرزا ایرج الملقب بہ داراب خان بھی

منصب ہزاری پر فائز ہوا۔ ۱۶۱۹ء میں فوت ہوگیا۔ (۲) میرزا داراب الملقب بہ داراب خاں بھی ایک ممتاز سپہ سالار تھا اسے شاہجہاں نے بغاوت کے دوران بنگال کا والی مقرر کیا تھا۔ لیکن وہ مہابت خاں کے ہاتھ لگ گیا اور مہابت خاں نے اسے ۱۶۲۵ء۔۱۶۲۶ء میں قتل کر دیا۔ (۳) میرزا رحمان داد ۱۶۱۹ (۴) میرزا امراللہ، جو جوانی میں فوت ہوگیا تھا۔

عبدالرحیم خانخاناں ایک ممتاز عالم اور سخنور اور سخن پرور، عربی و فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں کا ماہر تھا رحیم تخلص تھا اور چاروں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ وہ اپنی ہندی شاعری کی بدولت بہت مشہور ہے جو بھکتی کے احساسات سے لبریز ہے (جس میں وہ اپنا تخلص رحیمن کرتا ہے)۔ وہ ادب اور فنون لطیفہ کا بڑا سرپرست تھا اور مآثر رحیمی میں ایسے شعرا کی ایک طویل فہرست دی گئی ہے جو اس کے خوان کرم پر پرورش پاتے تھے۔ اس کی فیاضی اور سخاوت ضرب المثل بن گئی تھی۔ اِس کی فراخدستی کے واقعات بڑی تعداد میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس پر اگرچہ بارہا غداری اور بدعنوانی کے الزامات عائد ہوتے تاہم یہ حقیقت ہے کہ دکن کے مسائل پر اس کی گرفت کسی اور فعل سپہ سالار کی بہ نسبت زیادہ تھی۔

مذہبی عقائد کے اعتبار سے وہ سنّی مسلمان۔ شیخ احمد سرہندیؒ اور شیخ عبدالحق دہلویؒ جیسے دینی پیشواؤں نے اِسے راسخ العقیدہ مسلمان کہا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس کے مذہبی نظریات آزادانہ اور متصوفانہ تھے۔ معاصرانہ شہادت سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی کہ وہ درپردہ شعیہ عقائد کا پیرو تھا۔ اور تقیّہ کرتا تھا تاہم اس کے شیعی رجحانات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کتابیات

فارسی

ماثر رحیمی۔ عبدالباقی نہاوندی۔ ایشیاٹک سوسائٹی مغربی بنگال۔ کلکتہ۔ ۱۹۳۳ء تین جلدیں۔

اردو

۱ ماثرالامرا - نواب شمس الدولہ شاہنواز خان (اردو ترجمہ) جانکی پرکاشن پٹنہ ۱۹۷۹ء

۲ منتخب الباب۔ حاجی خان نظام الملک (اردو ترجمہ) نفیس اکیڈمی۔ کراچی۔ ۱۹۶۳ء

۳ دربار اکبری۔ محمد حسین آزاد۔ لاہور۔ ۱۹۳۹ء۔

۴ بزم تیموریہ۔ صباح الدین عبدالرحمان۔ اعظم گڑھ۔ ۱۹۴۸۔ تین جلدیں

5 شعرالعجم۔ شبلی نعمانی۔ اعظم گڑھ۔ جلد دوم

۶ مقالات شبلی۔ شبلی نعمانی۔ اعظم گڑھ۔ جلد دوم

۷ مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال۔ آر۔ ایس تریپاٹھی۔ ترقی اردو بیورو۔ ۱۹۸۰

۸ مغلیہ سلطنت کا مرکزی نظام۔ ابن حسن۔ ترقی اردو بیورو۔ ۱۹۸۲

۹ اکبر سے اورنگ زیب تک۔ مورلینڈ۔ ترقی اردو بیورو۔ ۱۹۸۱

۱۰ جہانگیر۔ ڈاکٹر بینی پرساد۔ ترقی اردو بیورو۔ ۱۹۸۴

۱۱ تاریخ ہند۔ مولوی ذکاءُاللہ۔ ۱۹۱۵۔ جلد چھ

۱۲ مکتوبات ربانی۔ ترجمہ مولانا محمد شبیر احمد نقشبندی۔ منزل نقشبندیہ۔ لاہور۔ ۱۹۱۳ء

۱۳ عبدالرحیم خانخاناں کی ہندی شاعری۔ عبدالرشید۔ سہ ماہی رسالہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد۔ جنوری ۴۴ ۱۹۴۴ء

۱۴ اصناف سخن۔ اور شعری ہیئتیں۔ شمیم احمد۔ انڈیا بک ایمپوریم۔ بھوپال ۱۹۸۱

۱۵ قومی تہذیب کا مسئلہ۔ سید عابد حسین۔ ترقی اردو بیورو ۱۹۸۰ ری پرنٹ

۱۶ قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ اٹھارویں صدی تک۔ محمد حسن۔ اترپردیش اردو اکیڈمی ۱۹۸۶

۱۷ آب کوثر ۔ شیخ محمد اکرام ۔ ادبی دنیا ۔ دہلی
۱۸ رودِ کوثر شیخ محمد اکرام ۔ ادبی دنیا ۔ دہلی
۱۹ موج کوثر شیخ محمد اکرام ۔ ادبی دنیا ۔ دہلی
۲۰ تذکرہ ابوالکلام آزاد ۔ ساہتیہ اکاڈمی ۔ نئی دہلی ۱۹۸۱ء
۲۱ ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج ۔ ڈاکٹر رفیق ذکریا ۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۔ ۱۹۸۵ء
۲۲ کاروانِ زندگی ۔ مولانا ابوالحسن ندوی ۔ مکتبہ اسلام ۔ لکھنؤ ۔ ۱۹۸۳ء
۲۳ تقویتہ الایمان ۔ شاہ اسماعیل شہید ۔ مکتبہ تھانوی ۔ دیوبند ۔ ۱۹۸۴ء

ENGLISH TRANSLATIONS FROM PERSIAN

Tuzak-e-Jahangiri or Memoirs of Jahangir — Tr. Alexander Rogers
Munshiram Manoharlal
New Delhi 1978

Muntakhabatu-T-Tawarikh — Al-Badaoni
Tr. V. I Georg S.A. Ranking
V. II W.H. Lowe
V. III Wolseley Haig
Renaissance Publishing House
New Delhi 1986

Akbarnama — Abul Fazal
Tr. H. Beveridge 3 vols.
Ess Ess Publication
New Delhi 1987

Ain-e-Akbari — Abul Fazal
Tr. VI. H. Blochmann
V. II, III S.J. Jarret
Crown Publishing
New Delhi 1988

ENGLISH

Indian Muslims — M. Mujeeb
George Allen and Unwin
London 1969

Shah Wali-Allah And His Times — Saiyid Athar Abbas Rizvi, *Ma'rifat Publishing House* Australia 1980

Shah Abdul Aziz Puritanism, Sectarian Polemics & Jihad — Saiyid Athar Abbas Rizvi, *Ma'rifat Publishing House* Australia 1982

Cambridge History of India Vol-IV — Wolseley Haig, *S. Chand & Company* New Delhi 1979

A House Divided — Amrit Rai, *Oxford University* Press 1984

Reading in Indian History — Mohmmad Yasin, *Atlantic Publisher & Distributor* New Delhi 1988

HINDI

Abdur Rahim Khan-e-Khanan — Dr. Surya Prasad Aggarwal, *Central Hindi Directorate* New Delhi 1971

Rahim Granthawali — Vidya Niwas Misr & Govind Rajmir, *Vani Prakashan* New Delhi 1985

Rahim Ke Sobodh Dohe — Viyogi Hari, *Sasta Sahitya Mandal* New Delhi 1986